کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حقوق کے تعین سے متعلق خود اپنی وہ وصیت نازل فرما دی جو سورۂ نساء میں مذکور ہے تو بندوں کی وصیت منسوخ ہو گئی، صرف اللہ تعالیٰ کی وصیت باقی رہ گئی۔ پھر بندوں کے لیے وصیت کا حق صرف ایک محدود دائرے کے اندر رہ گیا جس کا ذکر سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کے تحت آئے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸۰-۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲

ترجمۂ آیات ۱۸۰-۱۸۲

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا، خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہوا ور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

۶۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۱۸۰)

وصیت کا مفہوم

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ" فرض کر دینے کے معنی میں قرآن اور کلام عرب دونوں میں معروف ہے۔ وصیت کے لفظ کی

تحقیق پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے کہ عربی میں یہ لفظ کسی بڑے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین وہدایت کے معنی میں آتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ تلقین وہدایت کوئی شخص اپنے آخری وقت میں کرے یا عام حالات میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، قرآن میں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ وصیت چونکہ مصدری معنی میں ہے، نیز اپنے فعل سے فاصلہ پر واقع ہے، اسی وجہ سے تذکیر وتانیث کا لحاظ نہ تو فعل میں ضروری ہوا نہ بعد کی ضمیروں ہی میں۔

وصیت کے لیے دو شرطیں

اس وصیت کی فرضیت کے ساتھ دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس وقت کرے جب اسے اپنی موت قریب ہوتی نظر آنے لگے اور دوسری یہ کہ جب وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو۔ پہلی شرط کا ذکر 'اذا' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ موت کا مرحلہ سب کو پیش آتا ہے۔ دوسری کا ذکر 'ان' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ مال کا ہونا ہر ایک کے پاس ضروری نہیں۔ 'ان' اور 'اذا' کے استعمال کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ سے مخفی نہیں۔ وصیت میں یہ دونوں پہلو بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیتیں کر دیتے ہیں وہ لبا اوقات بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے وصیت سے گریز کرتے ہیں وہ لبا اوقات اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔

خیر کا لفظ مال کے لیے

خیر کے اصل معنی مطلوب ومرغوب شے کے ہیں اس وجہ سے علم، عقل، حکمت، عدل، نیکی اور بھلائی سب کے لیے اس کا استعمال ہے۔ پھر یہیں سے یہ مال کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ مال بھی ایک مرغوب مطلوب شے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے مال کے لیے اس لفظ کو اختیار کر کے گویا بالواسطہ اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے جو عام طور پر رہبانی تصور کے زیر اثر لوگوں میں پھیلی ہوئی تھی کہ مال فی نفسہٖ ایک ناپاک ونجس چیز ہے اس وجہ سے اللہ والوں کے لیے اس سے آلودہ ہونا جائز نہیں۔

معروف اور شریعت میں نسبت

مَعروف کے لغوی معنی جانی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، یعنی جس کو عقل مانتی ہو، جو عدل پر پوری اترتی ہو، اچھے لوگ جسے پہچانتے ہوں، سوسائٹی کے شریفوں میں جس کا چلن اور رواج ہو۔ یہ معروف بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس حیثیت سے قرآن میں اس کا جگہ جگہ حوالہ آیا ہے۔ اوپر دیت کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ قانون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو معروف پر مبنی ہے، دوسرا وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے۔ جس چیز کے بارے میں خدا کا قانون موجود نہ ہو اس میں معروف معتبر ہوتا ہے لیکن جس باب میں خدا کا قانون نازل ہو گیا اس میں معروف کا اعتبار ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ حکم وصیت عبوری دور کے لیے تھا

اس آیت میں والدین اور اقرباء کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم

دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے۔ اور دوسرے اس معروف کو از سرِ نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔

اور وصیت کے متعلق فرمایا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ حَقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں، جو اصل قانونِ وراثت سے پہلے گزری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی۔ اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضیلت کی نہیں تھی۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۸۱)

شاہدوں کی عظیم ذمہ داری

چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا، شریعت میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحبِ وصیت کی وصیت میں کوئی ردو بدل کریں گے تو اس کا سارا بارِ گناہ انھی کے سر ہو گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحبِ وصیت پر عائد ہو گی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لیے تنبیہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، وہ اس جرمِ عظیم کی سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۸۲)

'خوف' کے معنی

'خوف' کے اصل معنی گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے، اندیشہ کرنے کے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ ڈرنے کے معنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ایک حماسی شاعر کا شعر ہے۔

ولو خفت انی ان کففت تحیتی
تنکب عنی رمت ان یتنکبا

(اگر مجھے توقع ہوتی کہ میں بڑھاپے کا خیر مقدم نہ کروں گا تو وہ مجھ سے رک جائے گا تو میں اپنے خیر مقدم سے باز رہ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا)

یہاں زیر بحث آیت میں یہ لفظ اندیشہ گمان اور علم ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ کشاف نے اس معنی کی طرف اشارہ تو کیا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ہم نے اس کی دلیل پیش کر دی ہے۔

'جنف' کے معنی

"جَنَفٌ" کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں لیکن اس کا غالب استعمال نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ناانصافی کی طرف مائل ہونے کے لیے ہے۔ آیت میں یہ بے جا پاسداری اور ناروا جانب داری کے لیے

استعمال ہوا ہے۔

'اثم' کے معنی

'اثم' میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ پھر یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لیے استعمال ہوا، عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔ اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے یہ 'بر' کا ضد ہے 'بر' کا اصل مفہوم جیسا کہ ہم آیت ۱۷۷ کے تحت واضح کر چکے ہیں، ایفائے حق ہے۔ یہ لفظ 'عدوان' کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے کہ حقوق کے معاملہ میں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک کوتاہی اور حق تلفی کی نوعیت کے، دوسرے دست درازی اور تعدی کی نوعیت کے۔ پہلی قسم کے لیے اثم کا لفظ ہے، دوسری کے لیے عدوان کا۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ جنف کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جنف کے معنی ہم واضح کر چکے ہیں کہ جانب داری کے ہیں اس کے بالمقابل اثم کا ٹھیک مفہوم حق تلفی کا ہوگا۔ اور ایک نامنصف وصیت کرنے والے سے انھی دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے یا تو وہ وارثوں میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا یا کسی کی حق تلفی کا مرتکب ہوگا۔

تبدیلی کی ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے

اوپر والی آیت میں وصیت کرنے والے کی وصیت میں کسی تبدیلی کرنے کی نہایت شدت کے ساتھ ممانعت فرمائی گئی تھی اب اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ تبدیلی کی یہ ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے۔ اگر کسی وصیت کرنے والے کے اندر جانب داری یا حق تلفی کا رجحان محسوس ہو رہا ہے یا اس کی وصیت واضح طور پر جانب داری اور حق تلفی کا پہلو لیے ہوئے ہے تو وصیت کے گواہوں کی طرف سے اس جانب داری اور حق تلفی کی اصلاح کی کوشش اس تبدیلی کے حکم میں نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ یہ چیز جائز ہے۔ البتہ یہ اصلاح انھیں بطور خود کر دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انھیں فریقوں کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اگر اس کا موقع ہے کہ خود وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر عدل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو یہ راہ اختیار کی جائے ورنہ بصورت دیگر وارثوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مفہوم فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لیے کہ ان الفاظ کا واضح مفہوم ان کے درمیان مصالحت کرا دینا ہے نہ کہ بطور خود کوئی اصلاح کر دینا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۳-۱۸۷

روزے کا بیان تربیت نفس کے لیے

حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے مذکورہ بالا قوانین کے بعد اب یہ روزے اور اس سے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہماری معروف فقہی ترتیب کے لحاظ سے تو روزہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے اس وجہ سے خیال دل میں یہ گزرتا ہے کہ اس کا ذکر اوپر کی اس آیت کے ساتھ ہونا تھا جس میں نماز اور انفاق کا ذکر ہے لیکن قرآن حکیم میں احکام کے بیان کی ترتیب وہ نہیں ہے جو ہماری فقہ کی کتابوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے

بلکہ حکمت شریعت، اصلاح معاشرہ، تزکیۂ نفوس اور رعایت احوال کے تقاضوں کے تحت ہے۔ ان پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حرمتِ جان و حرمتِ مال کے قوانین کے بعد یہ روزے کا بیان اس عبادت کو سامنے لارہا ہے جو ضبطِ نفس اور تربیت تقویٰ کے لیے اسلام نے مقرر کی ہے تاکہ طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام، خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات و داعیات کو انسان لگام لگا سکے اور اپنے رہوار نفس کو اس راستے پر ڈال سکے جو تقویٰ کا راستہ ہے۔ روزہ صبر اور تقویٰ پیدا کرنے کی خاص عبادت ہے اور یہی صفات ہیں جو انسان کو دست درازی اور حق تلفی سے بچاتی بھی ہیں اور بر و احسان اور حق و عدل کے قیام پر ابھارتی بھی ہیں چنانچہ یہاں روزے کا حکم جس طرح پچھلے احکام پر عمل کے لیے تربیت کی بنیاد قائم کرتا ہے اسی طرح اس کے بعد جو احکام رشوت دہی کی ممانعت اور حج و جہاد سے متعلق آرہے ہیں ان کے لیے بھی صبر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ گویا ترتیب میں اس کے موقع و محل ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ روزہ اسلام میں کیوں فرض کیا گیا اور اس کے مقاصد و فوائد کیا ہیں، زندگی کن پہلوؤں سے اس سے متاثر ہوتی ہے اور پھر حیاتِ اجتماعی پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۸۳-۱۸۷

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

إِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾
أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ
لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ
أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا
مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى
اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ
حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

ترجمۂ آیات ۱۸۳-۱۸۷

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا
گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو
تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر
ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر
ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۸۳-۱۸۴

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور
حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں
موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری
کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمھارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے

کہ تم تعداد پوری کر لو اور اللہ نے جو تمھیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔ ۱۸۵

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔ ۱۸۶

تمھارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمھارے لیے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔ اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۳)

لفظ صوم کی تحقیق

صوم اور صیام مصدر ہیں۔ صوم کے لغوی معنی کسی شے سے رک جانے اور اس کو ترک کرنے کے ہیں۔ صام الفرس صوماً کے معنی ہیں گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا۔ نابغہ کا شعر ہے۔

خیل صیام وخیل غیر صائمة ۔۔۔ تحت العجاج واخری تعلك اللجما

بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدانِ جنگ کے غبار میں کھڑے تھے اور دوسرے بہت سے اپنی لگامیں چبا رہے تھے۔

مولانا فراہیؒ لفظ صوم کی تحقیق کے سلسلے میں اپنی کتاب اصول الشرائع میں فرماتے ہیں۔

"اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے باقاعدہ ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ مشکل اوقات میں وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کر سکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے۔ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آ جائے، بڑی کام آنے والی ہے ...... جریر نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ظللنا بمستن الحرور کاننا لدی فرس مستقبل الریح صائم

(ہم لُو کے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو بادِ تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو)

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اس کو بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہل عرب تشبیہ کے لیے انھی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے عام تجربے میں آتی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی ...... الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں اشعار بہت ہیں"۔

اسی سے صائم ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جائے۔ اس کے لیے کچھ مخصوص شرعی حدود و قیود ہیں جن کی تفصیل قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

روزہ تربیتِ نفس کی قدیم ترین عبادت ہے

"كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" یعنی روزہ کی یہ عبادت صرف تمھارے ہی اوپر پہلی بار فرض نہیں ہوئی ہے بلکہ تم سے پہلے دوسری امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ آسمانی شریعتوں میں یہ ابتدا سے تربیتِ نفس کی خاص ریاضت رہی ہے۔ مقصود اس بات کا حوالہ دینے سے صرف عام طبیعتوں کی گھبراہٹ دور کرنا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، شرائع الٰہی کی یہ قدیم وراثت ہے جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کو اختیار کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار ہو۔

روزے کا مقصد

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" یہ روزے کی اصل غایت بیان ہوئی ہے۔ تمام شریعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے، تقویٰ پیدا ہوتا ہے جذبات و خواہشات پر قابو پانے کی قوت و صلاحیت سے اور اس قوت و صلاحیت کی سب سے بہتر تربیت روزوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۴)

"گنتی کے چند دن" یعنی روزے کی یہ مشقت تم پر کچھ زیادہ مدت کے لیے نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ سال میں صرف گنتی کے چند دن اس کے لیے خاص کیے گئے ہیں جس طرح اوپر والی آیت میں كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ

مِنْ قَبْلِكُمْ" کے الفاظ تالیفِ قلوب کے طور پر آئے ہیں۔ اسی طرح "اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" کے الفاظ بھی بطور تالیفِ قلب وارد ہیں کہ تربیتِ تقویٰ اور تزکیۂ نفس کا یہ کورس چند روزہ ہے، اس سے پست ہمت اور دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ نفس پر شاق ہونے والی عبادت کے بیان میں قرآن مجید نے تالیفِ قلب کا یہ انداز اکثر مقامات میں ملحوظ رکھا ہے۔ انفاق اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ آگے زیادہ واضح مثالیں اس کی آئیں گی۔

'ایامِ معدودات' سے مراد

"گنتی کے چند دنوں" سے یہاں کیا مراد ہے؟ اہلِ تاویل کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہر ماہ میں یہی تین دنوں کے روزے فرض ہوئے تھے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد رمضان کے روزے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں فرض روزوں کی حیثیت سے صرف رمضان ہی کے روزوں کا علم ہے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے آنحضرت صلعم ہر ماہ میں جو تین دن کے روزے رکھتے تھے ان کی حیثیت فرض روزوں کی نہیں بلکہ نفلی روزوں کی تھی۔

امام ابن جریرؒ ان دونوں گروہوں کے اقوال نقل کر کے اپنی رائے دوسرے گروہ کے حق میں دیتے ہیں، ہمیں چونکہ ان کی اس رائے سے اتفاق ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک حق سے قریب تر بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ "اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" سے مراد ماہِ رمضان ہی کے ایام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قابلِ اعتماد روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں پر رمضان کے روزوں کے سوا کوئی اور روزہ فرض کیا گیا ہو جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوا ہو۔ آیت کا سیاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ جو روزے ہم پر فرض ٹھہرائے گئے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں، کوئی اور روزے نہیں ہیں۔ "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ" کے الفاظ خود ان ایام کی بلا کسی اشتباہ کے تعین کیے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ رمضان کے سوا کوئی اور روزے مسلمانوں پر فرض تھے، جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوئے ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی روایت پیش کریں جو حجت بن سکے۔"

بارہ مہینوں میں سے صرف ۳۰ یا ۲۹ دن کے روزے، روزوں کی روحانی برکات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی بڑی مدت نہیں ہے بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں اس وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اصلاحِ نفس کے طالب اس مدت کو کوئی طویل مدت نہیں سمجھتے بلکہ نہایت قلیل اور چند روزہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے اس کی اس قدر و قیمت نیز تالیفِ قلب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کو "اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

ب غلط تاویل

"وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ" کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ شروع

شروع میں جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو چونکہ اہل عرب اس سخت عبادت کے عادی نہیں تھے۔ اس وجہ سے ان کی آسانی کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی کہ جو شخص روزہ رکھنے کی قدرت کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہے وہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

اول تو روزے کی فرضیت کیا ہوئی جب کہ اس بات کی کھلی اجازت موجود تھی کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھے، نہ چاہے تو نہ رکھے، اس کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر روزے کے ابتدائی حکم کی نوعیت یہ تھی تو کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزے فرض کیے گئے) کا ٹکڑا بالکل غیر ضروری سا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی فرضیت بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ ایک طرف تو مریض اور مسافر دونوں کے لیے دوسرے دنوں میں اپنے قضا کیے ہوئے روزوں کی تعداد روزے رکھ کر پورے کرنے کا حکم ہو، جیسا کہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کے الفاظ سے واضح ہے اور دوسری طرف یہ آزادی ہو کہ جو شخص چاہے روزے رکھے اور جو شخص چاہے مقدرت کے باوجود، نہ رکھے، صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مریض اور مسافر پر تو یہ پابندی ہے کہ وہ روزے ضرور رکھیں، یہاں تک کہ اگر سفر یا مرض کے سبب سے معین دنوں میں نہ رکھ سکیں تو دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کریں درآنحالیکہ دوسروں پر کسی حالت میں بھی روزے رکھنا ضروری نہیں، ایک تندرست اور مقیم بھی چاہے تو روزے کا بدل ایک مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس مشکل سے بچنے کے لیے يُطِيقُونَهُ کے معنی یہ لیے ہیں کہ جو لوگ مشکل سے طاقت رکھتے ہیں۔ یہ معنی لے لینے سے اوپر کے اعتراضات تو رفع ہو جاتے ہیں اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الآیہ کے ٹکڑے کا ایک محل نکل آتا ہے لیکن اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے بھی بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ يُطِيقُونَ کے یہ معنی لغت میں ہیں بھی یا محض اپنے جی سے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک عربی لغت اس لفظ کے اس معنی سے بالکل خالی ہے۔ بعض لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے اس وجہ سے "اطاقت" کے معنی طاقت نہ رکھنے کے بھی آسکتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے تو انکار نہیں ہے کہ باب افعال کے خواص میں سے سلب ماخذ بھی ہے لیکن خاصیات ابواب کا معاملہ جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہے اس وجہ سے اصل شے لفظ کا استعمال ہے۔ اگر اہل زبان نے اس لفظ کو مذکورہ معنی میں استعمال کیا ہو اور اس کی مثالیں موجود ہوں تب تو بلاشبہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر اس معنی میں اس لفظ کے استعمال کی کوئی نظیر کلام عرب اور قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے تو محض اس مفروضہ پر کہ باب افعال کے خواص میں ایک خاصہ سلب ماخذ نامی بھی ہے، لفظ کو اثبات کے

بجائے نفی کے معنی میں لے لینا عربی زبان پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ چیز دین میں بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر کوئی صاحب اس اصول کو بے دھڑک استعمال کرنے لگ جائیں تو وہ، دین کے ایک بہت بڑے حصہ کو بڑی آسانی سے امر و حکم کے بجائے نفی و نہی سے بدل سکتے ہیں۔

بعض کم سواد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "فلاں شخص فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہے" اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس چیز کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل طفلانہ ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتے ہیں کہ طاقت رکھنے کے مفہوم میں مشکل کا یہ مضمون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ طاقت آدمی کو تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ کے اٹھانے کا ذمہ دار بناتی ہے یا اس کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بری قرار دیتی ہے۔ جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ طاقت آدمی کو مکلف بناتی ہے نہ کہ اس کو بری قرار دیتی ہے۔ جب آپ یہ کہیں کہ میں فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہوں تو اس کے واضح معنی یہی ہیں کہ آپ اس کے لیے مکلف ہونے کے درجہ میں ہیں نہ کہ اس سے استثنا کے درجہ میں، قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی طاقت آسانی سے رکھتے ہیں یا مشکل سے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر کہنا یہ تھا کہ "جو لوگ روزہ رکھنے کی مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تو اس کے لیے عربی زبان میں بیسیوں اسلوب اور الفاظ نہایت معلوم و مشہود موجود ہیں جو اہل زبان استعمال کرتے ہیں آخر ان کو چھوڑ کر قرآن نے ایک ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جس کا استعمال اس معنی کے لیے کسی کو معلوم نہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ "انا اطیق حمل السلاح" تو ہر شخص اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مطلب تو کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے اس وجہ سے مستحق ہے کہ اسے جہاد کی ذمہ داریوں سے بری رکھا جائے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ کہا جائے کہ "لنا طاقۃ بجالوت وجنودہ" تو اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ "ہمیں طاقت نہیں ہے، یا ہم مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تب تو قرآن میں بنی اسرائیل کا جو قول نقل ہوا ہے کہ "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ" اس میں لائے نفی کی مطلق ضرورت نہیں تھی بلکہ اثبات کی صورت میں ان کا مطلب صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔

اصل اشکال اور اس کا حل

بہرحال جن لوگوں نے 'یطیقون' کے یہ معنی لیے ہیں انھوں نے بالکل غلط معنی لیے ہیں لیکن یہ معنی اگر غلط ہیں تو اس کے معروف معنی لینے کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں جو اشکال ہے وہ یطیقون کے لفظ میں نہیں ہے، اس کے معنی تو وہی ہیں جو معروف و مشہور ہیں۔ اس کے سوا کسی اور معنی کے لیے اس لفظ میں کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے، دراصل اس میں اگر اشکال ہے تو 'یُطِیْقُوْنَهٗ' کی ضمیر مفعول میں ہے کہ اس کا مرجع کیا ہے؟ عام طور پر لوگ اس کا مرجع صوم کو مانتے ہیں اس

وجہ سے وہ سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ لیکن اس کا مرجع صوم نہیں بلکہ طعام ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہ تاویل ہمارے پچھلے اہل تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے لی ہے اور یاد پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تاویل بھی یہی ہے۔ یہ تاویل ہمارے نزدیک بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے کہ طعام کا لفظ چونکہ اوپر کہیں مذکور نہیں ہوا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر سے پہلے اس کے لیے ضمیر لانا اضمار قبل الذکر ہے، جو کلام کا ایک عیب ہے جس سے قرآن کو پاک ہونا چاہیئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اضمار قبل الذکر کلام کا ایک عیب ہے لیکن یہ عیب اس شکل میں ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں مقدم نہ ہو اور وہ اس کے لیے ضمیر لائے لیکن اگر مرجع متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور بعض تکرار سے بچنے کے لیے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو مؤخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر نہ صرف یہ کہ عیب نہیں ہے بلکہ کلام کی ایک خوبی ہے اور اس کی نہایت عمدہ مثالیں کلام عرب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ضمیر بھی جس کو ہمارے اہل نحو ضمیر شان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اسی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں بھی متکلم ضمیر درحقیقت اس مرجع کے لیے لاتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں مضمر ہوتا ہے۔

یہاں پوری بات یوں تھی کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ طَعَامَ مِسْكِيْنٍ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں تو ان کے لیے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے) لیکن اس صورت میں جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا تھا اس وجہ سے کلام کی روانی، ایجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعام مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لا دی جائے اور دوسری جگہ جہاں اس کا اظہار ناگزیر ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے اضمار قبل الذکر کی صورت تو ضرور پیدا ہوئی لیکن دیکھیے ضمیر اصلاً جس چیز کے لیے لائی گئی ہے وہ صرف عبارت میں مؤخر ہے متکلم کی نیت میں مؤخر نہیں ہے۔

اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوئے تھے اس میں اس بات کی بھی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیا کریں بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصلی شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوٹے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی، بعد میں یہ اجازت، جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہوگا، منسوخ ہو گئی، یعنی قضا شدہ روزوں کی

جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دے دیا گیا۔

"جو کوئی از خود کچھ مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو یہ زیادہ بہتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قضا روزے کا یہ فدیہ جو مذکور ہوا، یہ ایک مستطیع سے کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ نیز یہ کہ اس فدیہ کی نوعیت صرف ایک رخصت اور رعایت کی ہے، اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ آدمی فدیہ کے بجائے دوسرے دنوں میں یہ روزے ہی پورے کر دے۔ یہ گویا اس رخصت کے ساتھ ساتھ ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ اجازت عارضی اور وقتی ہے جو منسوخ ہونے والی ہے اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کی جائے چنانچہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اور آگے آ رہا ہے، کچھ عرصے کے بعد یہ فدیہ کی اجازت منسوخ ہو گئی اور فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کا اصل حکم باقی رہ گیا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۸۵)

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی جس میں ایک حقیقت تو یہ واضح کی گئی کہ رمضان کے مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے کیوں منتخب فرمایا۔ دوسری یہ کہ اب تک سفر یا بیماری کے سبب سے قضا شدہ روزوں کے لیے فدیہ کی جو اجازت تھی وہ اجازت منسوخ ہوئی۔ اب روزوں کی تلافی روزوں ہی کے ذریعہ سے ضروری قرار دے دی گئی۔

روزے کے لیے رمضان کے مہینے کے انتخاب کی حکمت

پہلی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے کہ یہی مبارک مہینہ ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس ہدایت کے متعلق فرمایا کہ یہ ہدایت بھی ہے اور اس میں ہدایت اور فرقان کی بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ صراط مستقیم کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عقل کی رہنمائی اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے وہ واضح اور قاطع حجتیں بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو کبھی کہنہ ہونے والی نہیں ہیں۔ لفظ "ہدیٰ" کی تحقیق اسی سورہ کی آیت ۲ کے تحت اور "فرقان" کی تحقیق آیت ۵۳ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ "بینات" سے مراد واضح، دل نشین اور ہر الجھن کو دور کر دینے والے براہین و حجج ہیں۔ قرآن صرف حلال و حرام بتانے کا ضابطہ ہی نہیں ہے بلکہ حجج و حکمت کے بینات کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ بھی ہے اس وجہ سے یہ رہتی دنیا تک عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرمایا

تاکہ بندے اس میں اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب، ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آسکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے، یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے ہی میں بھٹکتی رہتی ہے اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکر گزاری کا خاص مہینہ ٹھہرا دیا جائے تاکہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکر گزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے جیسا کہ اس سورہ کی بالکل پہلی ہی آیت میں اس نے خود یہ حقیقت واضح فرما دی ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ متقیوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا اس حکمتِ قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینہ موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشو و نما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ ...

یہ اوپر کے مبتدا کی اصل خبر ہے۔ یعنی یہ مہینہ اپنی مذکورہ خصوصیات کی وجہ سے روزوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو جو شخص اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس پورے ماہ کے روزے رکھے۔ حاضر ہونے کا مفہوم خود آگے کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ آدمی سفر یا بیماری کی حالت میں نہ ہو اور فَلْيَصُمْهُ کے معنی یہ ہوئے کہ اس پورے مہینہ کے روزے رکھے، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے، اور اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے روزے پورے نہ کر سکتا ہو تو دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر یہ کمی پوری کر دے۔ یہاں سے اوپر والی آیت کے الفاظ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حذف فرما دیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل حکم میں اس حصّہ کے بقدر ترمیم ہو گئی۔ سفر یا بیماری کے زمانوں کے چھوٹے ہوئے روزوں کے لیے اب تک، جیسا کہ اوپر گزرا، فدیے کی بھی اجازت تھی، مذکورہ الفاظ کے حذف ہو جانے سے وہ ختم ہو گئی۔

روزے کے احکام کی حکمتیں

آگے یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ سے آخر آیت تک صعودی ترتیب کے ساتھ اوپر کے تمام احکام کی حکمت و مصلحت واضح فرمادی۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں ان کو ایک مرتبہ پھر ذہن کے سامنے کر لیجیے۔ ایک تو یہ بات بیان ہوئی تھی کہ رمضان کا مہینہ روزوں کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟ دوسری یہ کہ فدیہ کی اجازت منسوخ کر دی گئی اب سفر اور بیماری کے زمانے کے روزوں کی تعداد بھی پوری کرنی ہوگی۔ تیسری یہ کہ سفر اور مرض کی حالت میں روزے دوسرے دنوں پر ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں کی حکمت و علت نیچے سے شروع کر کے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے یوں بیان فرمائی کہ سفر اور بیماری کی حالت میں روزے ملتوی کر دینے کی اجازت تمھیں اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ تمھیں کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا، فدیہ کی اجازت اس لیے منسوخ کر دی گئی کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس خیر و برکت سے محروم نہ ہو جو اس کے اندر مضمر ہے اور رمضان کے مہینہ کو اس کے لیے مخصوص اس وجہ سے فرمایا کہ تم اس نعمتِ عظمیٰ پر اللہ کی بڑائی اور اس کا شکر کرو جو تمھیں قرآن کی صورت میں اس مبارک مہینے میں عطا ہوئی۔ اس ترتیبِ صعودی کی مثالیں سورۂ قصص کی آیت ۲۳، اور انفال کی آیت ۱۱ میں موجود ہیں۔

لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمۡ میں تکبیر سے مراد خدا کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزہ دار پر روزے کی حالت میں عملاً طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل عمل ابن اٰدم یضاعف، الحسنۃ بعشر امثالہا الی سبع مائۃ ضعف، قال اللّٰہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ، یدع شھوتہ وطعامہ من اجلی' ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دوں گا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ احادیث میں جو رخصتیں حاملہ، مرضعہ یا پیر فانی وغیرہ سے متعلق بیان ہوئی ہیں وہ تمام تر یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ کے اصول یا اسی رخصت پر مبنی ہیں جو مریض و مسافر کے لیے بیان ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کی حکمت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گوشوں میں بھی وسعت دے دی ہے جو اس کے دائرہ میں آتے تھے۔ جن لوگوں نے یُطِیۡقُوۡنَ کے لفظ سے حاملہ یا مرضعہ وغیرہ کے لیے احکام نکالنے کی کوشش کی ہے انھوں نے دو بالکل غیر متعلق چیزوں میں جوڑ ملانے کا تکلف کیا ہے ہم اوپر اس کی تردید کر چکے ہیں۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۱۸۶)

شبہات اور مشکلات میں خدا کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت

یہ آیت تمہید ہے ان سوالوں کے جوابات کی جو روزے کے حکم کے نزول کے بعد ماہ رمضان کے احترام اور روزے کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے یا ان کی زبانوں پر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وضاحت فرمائی۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے یہ ہدایت فرمائی کہ اپنے اس قسم کے شبہات و اعتراضات کو خدا اور اس کی شریعت کی مخالفت یا اس کی تنقید و تضحیک کا ذریعہ نہ بنا لیں بلکہ ان میں رہنمائی کی طلب کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کریں۔ جو آدمی اخلاص و صداقت کے ساتھ اپنی کسی حقیقی ضرورت کے لیے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، خدا اس کی طلب ضرور پوری کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ ضرورت اس کی معاش سے متعلق ہو یا معاد سے، ذہنی و عقلی الجھنوں سے متعلق ہو یا شریعت اور اس کے احکام کے فوائد و مصالح سے۔

منافقین کا حال یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو دین کی کسی بات میں کوئی مشکل محسوس ہوئی وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اس بات کو اعتراض و استہزا کا نشانہ بنا لیتے اور مسلمانوں کے اندر وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی کی ایک مہم شروع کر دیتے۔ قرآن میں ان کی اس خصلت کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ خاص طور پر سورۂ مجادلہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے ہیں۔ اہل ایمان کی پسندیدہ روش قرآن نے یہ بتائی کہ وہ اپنی مشکلات کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مشکلات دور فرما دیتا ہے۔

یہ تمہید ایک جامع تمہید ہے جو مختلف مواقع کے ساتھ مناسبت رکھنے والی ہے لیکن یہاں اس کا تعلق، جیسا کہ ذکر کیا گیا، خاص طور پر ماہ رمضان اور اس کے روزوں کے باب میں چند سوالوں کے جواب سے ہے۔ یہ سوالات مسلمانوں کے اندر جب پیدا ہوئے تو قرآن نے ان کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کی کہ جب خدا اور اس کی شریعت سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو تو اس کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا سب سے قریب ہے اور وہ سب کی مشکلات حل فرماتا ہے۔

(وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ) میرے متعلق سوال سے مراد ضروری نہیں کہ خدا کی ذات و صفات ہی سے متعلق سوال ہو بلکہ یہ سوال اس کی ذات و صفات، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے احکام و شرائع سب ہی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ سوال کا تعلق ان احکام سے ہے جو ماہ رمضان اور روزوں کے آداب و شرائط سے متعلق اصل حکم کے نزول کے بعد پیدا ہوئے۔ قرآن کے تدبر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں سائلوں کے سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں، سوال کی اصل نوعیت اس جواب سے واضح ہوتی ہے جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ سوال کے اجمال کے ساتھ نقل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلام غیر ضروری طوالت سے محفوظ رہے، دوسری یہ کہ اکثر سوالوں کے جواب میں قرآن کی وضاحت صرف سوالوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ جب اس کا ابر کرم برسا ہے تو اس نے خشک و تر سب ہی کو سیراب

کر دیا ہے۔ جواب کی اس وسعت و ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہوا کہ سوال مبہم شکل میں نقل کیا جائے تاکہ سوال اور جواب میں عدم مطابقت نمایاں نہ ہو۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے موزوں مواقع آگے آئیں گے اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

خدا اور بندے کا تعلق

"فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ خدا سے قرب و بُعد کا انحصار بندے کے اپنے دل کی حالت پر ہے۔ اگر بندہ خدا سے غافل اور بے پروا ہے تو اس سے زیادہ دور کوئی چیز بھی نہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف متوجہ رہے، اس کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر گزار رہے اور اس کی آزمائشوں میں طلبِ صبر و استقامت کے لیے اسی کے آگے روئے اور گڑگڑائے تو خدا سے زیادہ قریب بندے سے کوئی چیز بھی نہیں۔ وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ قرابت بندوں کو یوں تو ہر حال اور ہر مقام میں حاصل ہے لیکن خاص کر نبی کی بعثت کا زمانہ تو، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، خلا سے قرب و اتصال کا خاص زمانہ ہوتا ہے۔ نبی خدا کا نائب اور بندوں کا وکیل ہوتا ہے۔ خدا کے فرشتے ہر وقت اس کے پاس آتے رہتے ہیں، وحی کا سلسلہ اس کے اور خدا کے درمیان قائم رہتا ہے۔ بندے اپنی جو مشکلات اور اپنے جو سوالات نبی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ گویا اس کے واسطے سے اپنے رب کے حضور ہی میں پیش کرتے ہیں اور وحی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ توقع ہوتی ہے کہ جو سوال اس کے حضور میں پیش ہوا ہے اس کا جواب نازل ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف مائدہ کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۱۰۱) (اور اگر تم ان کی بابت اس زمانے میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی)

"اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" بھی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ جواب دینے سے مراد قبولیت کا جواب ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ بندہ اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی مدد، فریاد رسی اور داد رسی کو نہ پہنچے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بندہ اخلاص و تضرع کے ساتھ پکارے اور اسی چیز کے لیے پکارے جس کے لیے پکارنا اس کو زیبا ہے۔ اگر بندہ اپنے رب سے وہ چیز مانگتا ہے جو مانگنے کی ہے اور اس طرح مانگتا ہے جس طرح مانگنا چاہیے تو وہ چیز اس کو ضرور عطا ہوتی ہے۔ اگر فوراً عطا نہیں ہوتی تو اس کے مستقبل کے لیے یا اس کی آخرت کے لیے خدا کے ہاں محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ملتی جس شکل میں اس نے مانگی ہے تو اس سے بہتر شکل میں وہ اس کو مل جاتی ہے یا اس کے لیے محفوظ کر دی جاتی ہے۔ قبولیتِ دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص سنّت ہے جس کے مختلف اجزا اپنے اپنے مقامات میں بیان ہوں گے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ، اوپر اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا یا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ بندوں سے قریب تر بھی ہے اور وہ ان کی پکار سنتا اور اس کا جواب بھی دیتا ہے

تو پھر اسی کا حق ہے کہ سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس پر ایمان لائیں، پھر اس سے منحرف ہو کر کسی اور کی طرف رخ کرنے کے لیے کوئی ادنیٰ وجہ جواز بھی نہیں ہے۔ خاص کر یہ تو اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ہے کہ جو پروردگار اپنی شریعت کے اجمالات کی توضیح خود فرمانے کے لیے سراپا رحمت و کرم ہے اس کے کسی حکم کو کوئی اعتراضات و شبہات کا ہدف ٹھہرائے یا اس کے سبب سے کسی خیانت یا تنگی میں مبتلا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اہل ایمان کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے کہ اگر ان کو خدا اور اس کی شریعت کے باب میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو وہ خدا اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کریں، اللہ تعالیٰ ان کی کھٹک دور فرمائے گا۔ بظاہر یہ بات اس ہدایت کے خلاف معلوم ہوتی ہے جو لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اور اس کی ہم معنی دوسری آیات میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ جہاں سوالات کرنے کی ممانعت ہے وہاں اس سے مراد اس طرح کے غیر ضروری سوالات ہیں جو یہود اپنے پیغمبر سے محض اس کو زچ کرنے اور شریعت سے فرار اختیار کرنے کے لیے کرتے تھے۔ وہ سوالات اس کے تحت نہیں آتے جو شریعت کی توضیح و تبیین کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور ان کے جوابات سے دین کی دولت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کے مواقع فراہم کیے ہیں تاکہ لوگوں پر دین کی حکمتیں اور مصلحتیں اور بندوں کی ضروریات کے ساتھ شریعت کی مناسبتیں واضح ہوں۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۸۷)

روزے سے متعلق سوالات کے جوابات

اوپر کی تمہید کے بعد اب یہ ان سوالات کا جواب ہے جو روزے کے احکام و آداب سے متعلق اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ اس کے آخر میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت اصل حکم کے نزول کے کچھ عرصہ بعد توضیح و تبیین کے طور پر نازل ہوئی۔ جو لوگ قرآن مجید کے اندازِ بیان سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں جب کسی حکم کے بعد اس کی کوئی مزید توضیح و تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بعد میں بطورِ وضاحت نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن سے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ہوا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ "رفث" کے اصل معنی تو شہوانی باتوں کے ہیں

لیکن یہاں اس کے بعد الٰی کا صلہ اس کے اندر بیویوں سے اختلاط و ملاقات کا مضمون پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے جائز کر دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی تھی بعد میں یہ جائز کر دی گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی حکم میں اس قسم کی کوئی وضاحت چونکہ موجود نہیں تھی اس وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بنظرِ احتیاط و تقویٰ یہ سمجھا کہ جس طرح روزے کی حالت میں، دن میں زن و شو کے تعلقات کی اجازت نہیں ہے اسی طرح شب میں بھی اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچی ہوگی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً پھر شروع ہو جاتا تھا جس کے سبب سے انھیں شب میں بھی وہ پابندیاں نباہنی پڑتی تھیں جو دن میں تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کے سامنے عملی مثال کی حیثیت سے اہل کتاب ہی کا روزہ تھا اور قرآن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا اس وجہ سے انھوں نے از خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی کہ دن کی طرح شب میں بھی ازدواجی تعلقات سے احتراز کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں چونکہ اب تک کوئی واضح ہدایت نہیں تھی اس وجہ سے اس کی نوعیت ایک مشتبہ معاملہ کی تھی۔ اس اشتباہ کے سبب سے بعض لوگ نفس کی اکساہٹ کے باعث کبھی کبھی اس چیز کے مرتکب بھی ہو جاتے جو خود ان کے ضمیر کے نزدیک مشتبہ ہوتی۔ مشتبہ معاملات میں شریعت کی ہدایت، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، یہ ہے کہ "دع ما یریبک الی ما لا یریبک" مشتبہ کو چھوڑ کر آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جو غیر مشتبہ ہو۔ اگر اس کے برعکس آدمی مشتبہ پہلو کو اختیار کرے تو یہ خود اپنے نفس کے ساتھ ایک قسم کی خیانت ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا لیکن چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی محتاط مسلمانوں نے از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور واضح الفاظ میں شب میں بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

میاں بیوی کے لیے لباس کے استعارے کی بلاغت

"ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ" (وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو) میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے ہیں، یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے یہ بتانا ہے کہ ان دونوں میں ایسا چولی دامن کا رشتہ ہے اور یہ باہم دگر ایسے فطری تقاضوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے دینِ فطرت نے ان کے باہمی تعلق پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی ہے جو فطری داعیات کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کر دے۔ اگر کوئی محدود قسم کی پابندی خاص خاص حالات میں عائد بھی کی گئی ہے تو وہ صرف تربیتِ نفس کی ضرورت کی حد تک ہے، ذرا بھی اس سے متجاوز نہیں ہے۔

میاں اور بیوی کے لیے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

لباس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے جسم کے لیے ساتر ہوتا ہے۔ اس سے اس کے

عیوب برہنگی کو پردہ پوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو کر حیوانات کے درجے میں آجائے۔ ٹھیک اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لیے پردہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے اندر جو صنفی میلانات ابھرتے ہیں وہ ان کی تسکین اور آسودگی کے لیے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہو تو جذبات کا ہیجان جنسی انارکی کا ایک ایسا طوفان برپا کر دے کہ کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔ جسم کے جو حصے اپنے اندر جنسی کشش رکھتے ہیں وہ عریاں ہونے کے لیے زور لگائیں، زبان اور قلم پر فحاشی کا سنجار و ہذیان طاری ہو جائے، دل ہرزہ گرد اور نگاہ بالکل آوارہ ہو کر رہ جائے۔ ہمارے نفس کے ان سارے عیوب کی پردہ پوشی اگر ہو سکتی ہے تو صرف بیوی کے لیے شوہر کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور شوہر کے لیے بیوی کے ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو باحیا بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز نکاح کو قرار دیا ہے۔ حیا کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خود ایک باطنی لباس ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اصلی لباس یہی ہے، باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو اختیار کرتے ہیں اور حیا قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی چیز سے بھی نہیں ملتی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ زینت ہے۔ یہ درجہ ستر پوشی کے بعد کا ہے۔ انسان لباس کے ذریعہ سے آرائش، حسن و جمال اور تہذیب و سلیقہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے اور تمدن و ترقی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ غور کیجیے تو یہی چیز اس سے بلند تر درجے میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ انسان نے تہذیب و تمدن کا پہلا قدم اسی دن اٹھایا جس دن پہلے مرد نے پہلی عورت سے اپنا تعلق استوار کیا۔ یہ بات اپنے اندر ایک بہت بڑی حقیقت رکھتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مرد کے اندر گھر در کی خواہش، تجمل و تزئین کا جذبہ، حصول مال و جائداد کا ولولہ اصلاً عورت کے تعلق ہی سے پیدا ہوا، بعد میں دوسرے عوامل کی شرکت سے اس میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح عورت کی زینت و آرائش، اس کے سگھڑ پن اور سلیقہ اور اس کی گھرداری کے جوش و انہماک میں اصلی دخل مرد کی تسخیر کی خواہش کو ہے۔ عورت اور مرد میں سے کوئی بھی اگر اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو جائے تو ان کے تمام مذکورہ جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ مرد اگر بیوی سے محروم ہو تو ایک مسافر بلکہ کچھ خانہ بدوش سا بن کے رہ جاتا ہے، اسی طرح عورت اگر شوہر سے جدا یا اس سے محروم ہو تو اس کے سارے احساسات مردہ اور اس کے سارے اسلحہ زنگ آلود اور کند ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کا باہمی ارتباط و تعلق ہی ہے جس کے صدقے میں گھریلو زندگی کی وہ تمام رونقیں اور بہاریں ہمیں نصیب ہوتی ہیں جن سے دنیا میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ سردی اور گرمی کی سختیوں اور دشمن کے بہت سے خطرات سے آدمی

کو محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھیں حملہ سے محفوظ رکھے) اخلاقی پہلو سے ٹھیک یہی حال عورت کا مرد کے لیے اور مرد کا عورت کے لیے ہے۔ عورت مرد کے لیے زرہ اور بکتر ہے اور مرد عورت کے لیے زرہ اور بکتر ہے۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے زرہ اور بکتر سے آراستہ اور مسلح ہوں تو شیطان کے حملے ان میں سے کسی پر بھی کارگر نہیں ہوتے اور اگر وہ اس لباس سے عاری ہوں تو دونوں ہی کے لیے شیطان سے مار کھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ بیوی کو سفر و حضر میں گلے کا تعویذ بناؤ تاکہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو۔

لباس کے یہ تینوں مقصد قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی اعتبارات سے عورت مرد کے لیے اور مرد عورت کے لیے لباس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جو دین فطرت ہے، ان کے تعلق کی اس فطری اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اس کو نہ صرف یہ کہ تقویٰ کے خلاف نہیں قرار دیا بلکہ، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا ہے، اس کو مختلف اعتبارات سے تقویٰ کا معاون قرار دیا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں مسلمانوں نے غلط فہمی کے سبب سے، یا اہل کتاب کے طریقہ سے متاثر ہو کر، اپنے اوپر اس سلسلہ میں جو پابندی عائد کر لی تھی اس آیت کے ذریعہ سے وہ دور فرما دی گئی۔

خیانت سے کیا مراد ہے

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض لوگوں نے یہ گمان رکھتے ہوئے کہ رمضان میں دن کی طرح راتوں میں بھی ازدواجی تعلقات جائز نہیں ہیں، اس کی خلاف ورزی کی۔ اس چیز کو قرآن نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ مشتبہ معاملات میں آدمی کو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جس میں احتیاط ہو اور پھر اسی کا التزام کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز اس کے اجتہاد یا گمان میں حکم شریعت ہے (اگرچہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم نہ ہو) اس نے اس کی خلاف ورزی کی اور یہ چیز واضح طور پر اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت ہے۔ ہمارے نزدیک یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر ایک چیز اس کے اجتہاد کی رو سے صحیح ہے تو پھر اس کی خلاف ورزی اس کے لیے درست نہیں ہے الا آنکہ دین ہی اس کے لیے متقاضی ہو ——— مگر یہ پابندی چونکہ منشائے الٰہی کے خلاف تھی اس وجہ سے اس خیانت پر اللہ تعالیٰ نے گرفت تو فرمائی لیکن ساتھ ہی معاف بھی فرما دی اور آئندہ کے لیے واضح الفاظ میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔

ازدواجی زندگی کا اصل مقصد

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (اور اللہ نے جو کچھ تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو) یعنی اولاد جو ازدواجی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمھارے اختیار یا اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود

یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بقائے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تب تو اس کا چھاپ انسان پر بُرا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصلی غایت پر ہو تو یہ بھی عبادت ہی میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبطِ ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل مقصد کی اہمیت دے رہی ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ یہ چیز ہمارے روزوں کو اہل کتاب کے روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں تھی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اسی بات کی تائید احادیث اور صحابہؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے محض احتیاط میں غلو کے سبب سے اپنے یا دوسروں کے روزے محض معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اس قدر واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے دور میں ان کا مفہوم سمجھنے میں بعض لوگوں کو زحمت کیوں پیش آئی؛ عدی بن حاتمؓ کی روایت، جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہے کہ انھوں نے فجر کو پہچاننے کے لیے دو سیاہ و سفید دھاگے باندھ لیے اگر پوری طرح قابلِ اعتماد ہے تو اس کو محض ان کی اس شدتِ احتیاط پر محمول کرنا چاہیے جو نئے نئے اسلام لانے والوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی باتوں کو صحابہؓ کی فہم و بصیرت پر طعن کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔

اعتکاف سے مراد

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ عَکَفَ کے اصل معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے کے ہیں۔ اصطلاحِ دین میں اس سے مراد ہر چیز سے الگ ہو کر یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو اعتکاف کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ رمضان کے مہینے اور مسجد سے اس عبادت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اعتکاف سے مقصود چونکہ تَبَتُّل اِلَی اللہ ہے اور اس میں دل کی کامل یکسوئی مطلوب ہے، نیز مسجد کا قیام اس کے لوازم میں سے ہے اس وجہ سے اس کے دوران میں بیویوں سے زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے نفس کی آزادی کے لیے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پوری احتیاط سے نگرانی کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ان سے بچائے رکھنے کے لیے ذرا ان سے دور ہی دور رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو جانور کسی چراگاہ کے بالکل پاس پاس چرتا ہے اس کے متعلق

بڑا اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر جا پڑے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی حکم کے نزول کے بعد لوگوں کے سوال پر یا محض حالات کے اقتضا کے تحت اس حکم ہی کے متعلق کچھ مزید تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے بعد بالعموم یہ آیت آگئی ہے۔ اسی سورہ میں اس کی بعض مثالیں آگے آرہی ہیں اس وجہ سے ہم یہاں اس کے نظائر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس قسم کی تفصیلات سے چونکہ تقویٰ کے طالبوں کے لیے تقویٰ کی مزید راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے فرمایا کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۳۔ روزے کا اثر انسان کی صلاحیتِ کار پر

اس زمانہ میں جو لوگ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی سے متاثر ہیں وہ روزے کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس سے انسان کی صلاحیتِ کار اور اس کی قوتِ کارکردگی بہت کم ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کرنے والے دو بنیادی حقیقتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے۔ اس کے روحانی وجود کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل نا آشنا ہیں کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔" اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے انی ابیت، لی مطعم یطعمنی وساق یسقینی میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔

انسان اگر صرف گوشت پوست کا مجموعہ ہے تب تو بلا شبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی تازگی و توانائی کے لیے بھی کوئی غذا اور تدبیر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دودھ مکھن، جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے لیے بھی کافی ہیں یا اس کے لیے کسی اور تدبیر و غذا کی ضرورت ہے؟ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق و توصل اور اس کے کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اس وقت ہوتا ہے جب یہ جسم کے (جو اس کے لیے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہے) تقاضوں، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ انھی سفلی پابندیوں

میں گرفتار رہتی ہے۔ اس وقت تک یہ ان بلندیوں میں پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کی اصلی جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اس کے وہ شاہینی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ روح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان کی قوتِ ضبط اور اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحبِ عزم والیمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجیے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصلی خزانہ اس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اس کے دل اور اس کی روح کے اندر ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوب صورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے خوف و بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ، دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی روح بیدار، جن کے دل پُر عزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نانِ جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدرؓ کے کارنامے دکھاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ اور اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری حقیقت جس سے یہ معترضین غفلت برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس کے مستقل اور پائیدار اثر سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے جو زندگی پر اس کا پڑتا ہے یا متوقع ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح طور پر اس کو برتا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دوا تقویتِ قلب و دماغ کے لیے نہایت مفید و مجرب ہو، اس کے اثرات نہایت پائیدار مترتب ہوتے ہوں، لیکن فوری طور پر اس کا ردِ عمل سستی یا اعضا شکنی یا خمار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہو، ظاہر ہے کہ اس دوا کے اس فوری اثر کو دلیل قرار دے کر اس کو ایک مضر یا بے قیمت دوا قرار دے دینا کسی طرح بھی صحیح

نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال روزے کا ہے۔ اس کا فوری اثر ــــ خاص طور پر خام اور نومشق لوگوں پر ــــ تو ضرور کسل اور اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے وقتی طور پر ان کی صلاحیتِ کار بھی متاثر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کی چیز اس کا یہ وقتی اثر نہیں ہے بلکہ وہ پائیدار اثر ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر، بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک برتا جائے، اس کا مترتب ہوتا ہے۔

روزے کے لیے عربی میں، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، صوم کا لفظ ہے۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ ابتداً یہ لفظ ان گھوڑوں کے لیے استعمال ہوا جن کو جوانی پر آنے کے بعد، جنگ کے لیے تیار کیا جاتا اور اس تیاری کے لیے بتدریج ان کا چارہ اور دانہ کم کیا جاتا تاکہ ان کا بدن بھاگ دوڑ کے لیے سبک نکل آئے اور وہ میدانِ جنگ کی سختیوں اور بھوک پیاس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے اچھی طرح قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں پر یہ عمل اس لیے نہیں کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کم ہو جائے بلکہ مقصود اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کے لیے پوری طرح کارآمد ہو جائیں۔ ایک پلے ہوئے گھوڑے پر اگرچہ اس ٹریننگ کا فوری اثر اچھا نہیں پڑتا، وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے، لیکن ٹریننگ دینے والے اس کے اس پائیدار اثر کو نگاہ میں رکھتے ہیں جو گھوڑے کو ہر سختی و نرمی کے برداشت کے قابل بنا دیتا ہے اور جس سے وہ تھان پر بندھے ہوئے ایک پرخور جانور کے بجائے میدان جنگ کا ایک سخت کوش اور جاں باز سپاہی بن جاتا ہے۔

یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیتِ کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ اس صلاحیتِ کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے اپنے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً، اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں، یہی ظاہر ہونا چاہیئے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو، اس کی قوتِ برداشت بڑھ جائے، وہ جہادِ زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے۔

غور کیجیے کہ یہ انسان کی صلاحیتِ کار کا گھٹنا ہے یا بڑھنا ہمارے نزدیک تو جن کے اندر یہ صفات ہوں وہی درحقیقت انسانیت کے گل سر سبد ہیں۔ جن میں یہ صفات نہیں وہ آدمی نہیں بلکہ گاڈ پرداری ہیں۔

۶۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیت ۱۸۸

روزے سے آگے اور پیچھے کے احکام میں مناسبت

اوپر ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ روزے کے حکم سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور دوسروں کے اموال و املاک غصب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس سے شریعت کے نظام میں روزے کا مقام واضح ہوتا ہے کہ اس عبادت کا اصل مقصود حرص و طمع، بخل اور لالچ اور اس قبیل کی دوسری بیماریوں پر قابو پانا ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو حقوق و معاملات میں اس کو عدل پسند اور محتاط بناتا ہے۔ گویا جن چیزوں سے بچتے رہنے کی ہدایت کی ان سے نفس کو بچانے میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ہو سکتی ہے اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ روزے کے بیان سے پہلے تو حق داروں کے لیے وصیت کرنے کی، اس وصیت میں عدل و انصاف اور پھر اس وصیت کے، ایمان داری کے ساتھ، اجرا و نفاذ کی ہدایت کی ہے اور روزے کے بیان کے بعد رشوت کے ذریعہ سے حکام کو خریدنے اور اس چیز کو دوسروں کے حقوق کے غصب کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ شرک کی ملاوٹ سے پاک ہے، جہاں اس میں شرک ملا زندگی کے لیے اس کی ساری افادیت ختم ہوئی اسی طرح قانون کی ساری افادیت اسی وقت تک ہے جب تک قانون کے نفاذ کے لیے دیانت دار حکام موجود ہیں اور معاشرہ رشوت کی بیماری سے پاک ہے، جہاں رشوت معاشرے میں رواج پائی بس قانون کی افادیت کا جنازہ نکلا۔ اس وضاحت کی روشنی میں غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ گویا ایک ہی حکم کے دو پہلو یہاں مذکور ہوئے۔ ایک کا ذکر روزے سے پہلے کیا، دوسرے کا بعد میں اور روزے کا ذکر دونوں کے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نظمِ کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مطامع اور ان خواہشات پر غالب کرنا چاہتا ہے وہ اپنے نفس کی تربیت روزے سے کر کے یہ چڑھائی چڑھ سکتا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیت تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیت ۱۸۸

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

ع ۲۳

ترجمۂ آیت ۱۸۸

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ

نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو۔ درآنحالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو۔

۶۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اکلِ اموال بالباطل کا مطلب

"وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" اکلِ اموال سے مراد محض کھانا نہیں بلکہ اس کا ناجائز استعمال و تصرف ہے۔ باطل حق کا ضد ہے، جس طرح حق کا لفظ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، مختلف معنوں میں آتا ہے اسی طرح اس کا ضد بھی مختلف معنوں میں آتا ہے۔ باطل ایک تو عبث اور بے مقصد کے معنی میں آتا ہے، مثلاً "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا" (۱۹۱۔ آل عمران) پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے) اس کے دوسرے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جس کی عقل یا فطرت یا شریعت کے اندر کوئی بنیاد نہ ہو۔ مثلاً وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہِ الْحَقَّ ۵ غافر (اور انھوں نے باطل کے ذریعہ سے مخالفت کی تاکہ اس سے حق کو پسپا کریں) اسی طرح باطل اس طریقہ کو کہتے ہیں جو عدل و انصاف، شریعت، معروف اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے۔ دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل آگئی ہے اور پھر مزید تفصیل احادیث میں ہے۔ اسلام میں تمام معاملات کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔

'ادلاء' کا مفہوم

وَتُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ۔ اِدْلَاءٌ کے اصل معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے فَاَدْلٰی دَلْوَہٗ (یوسف) یہیں سے اس کے اندر رسائی اور قربت حاصل کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسّی کے ذریعہ سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح مال رشوت حکام تک رسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ فرمایا کہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے لیے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس لیے کہ رشوت حصولِ مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ اثم یعنی گناہ، حق تلفی اور غصب حقوق کا راستہ ہے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمھیں معلوم ہے۔ تمام دنیا کے معروف اور ہر دین و شریعت میں اس کا گناہ ہونا مسلم رہا ہے۔ عقل کے نزدیک بھی اس کا گناہ ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

اس جملہ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور چونکہ یہ پہلے جملے ہی کی وضاحت کر رہا ہے اس وجہ سے اس میں حرف 'لا' کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اسی سورہ کی آیت ۴۲ کے تحت ہم اس اسلوب کی بقدرِ ضرورت تشریح کر چکے ہیں۔

رشوت کی مومت کے مختلف پہلو

یہ آیت رشوت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتی ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہاں دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر اسی چیز کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ قانون، جو لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی افادیت کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے فصل کے شروع میں اشارہ کیا احکام کی راست روی اور دیانت پر ہے۔ وہی قانون کے اصلی محافظ ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان کو کسی ذریعہ سے بددیانت بنا دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حقوق لکاؤ مال ہیں جس کے پاس پیسے ہوں وہ ان کو خرید سکتا ہے۔ رشوت حکام کو بددیانت بنانے کا ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔

دوسرا یہ کہ رشوت کی گرم بازاری میں سب سے زیادہ مؤثر عامل خود معاشرہ ہے۔ جب لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح حکام کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے منہ رشوت کا خون لگ جاتا ہے تو وہ اس کے ایسے رسیا ہو جاتے ہیں کہ وہ رشوت لیے بغیر لوگوں کو خود ان کے واجبی حقوق بھی نہیں دیتے۔ اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بدآموزی سے چور نہ بناؤ۔ اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لیے ان کے قبول کرنے کو بھی، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، پسند نہیں کیا اس لیے کہ یہ بھی رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔

تیسرا یہ کہ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں۔ عقل اس کی گواہ ہے، فطرت انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (اور تم اس بات کو جانتے ہو)

۶۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۹-۲۰۳

اوپر روزے کے بیان کے ساتھ جس پہلو سے ضمناً لوگوں کے مال ہڑپ کرنے اور اس کے لیے رشوت کو ذریعہ بنانے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے، اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب آگے حج اور جہاد کا بیان آ رہا ہے جن کی مناسبت روزے کے ساتھ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

حج بھی درحقیقت ایک جہاد ہے اور جہاد صبر و برداشت کی جن صفات کا متقاضی ہے وہ سب سے بہتر طریقہ پر روزے سے پیدا ہوتی ہیں۔ حج کے بیان کے سلسلہ میں سب سے پہلے ان محترم مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے سوال کو نقل کیا ہے جو حج و عمرہ کے لیے مخصوص اور اشہر حرم

کے نام سے معروف ہیں۔ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو امت مسلمہ کا قبلہ اور کفار کے قبضہ سے اس کو آزاد کرانا ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ قبلہ کی بحث میں (آیات ۱۴۲ تا ۱۶۰) گزر چکا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حج کے لیے جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ پھر اس جہاد کے تعلق سے کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ اس جہاد کی نوبت محترم مہینوں میں آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان محترم مہینوں میں جنگ ہمیشہ سے ممنوع رہی ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی عرب ان کا پورا احترام کرتے رہے ہیں اور اسلام نے بھی ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اگر اس جنگ کی نوبت عین حرم اور حدود حرم میں پیش آئے تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ حرم میں جنگ تو درکنار اس میں کسی جاندار کو چھیڑنے کی بھی زمانہ قدیم سے ممانعت تھی۔ اسی طرح جہاد کے تعلق سے انفاق کا سوال بھی سامنے آیا اس لیے کہ جہاد ممکن نہیں ہے جب تک کہ لوگ جان کے ساتھ ساتھ اپنے مال بھی پوری فیاضی سے راہ خدا میں خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ انفاق اس انفاق سے زائد ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس طرح گویا حج کے مسئلے نے اپنے اندر حج کے مسائل و احکام کے ساتھ ساتھ گوناگوں سوالات وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر جہاد، اشہر حرم اور انفاق وغیرہ سے متعلق بھی جمع کر لیے۔ ایک ظاہر بین جب ان مختلف قسم کے مسائل کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا ہوا دیکھتا ہے تو اس کو کلام میں بے ربطی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اس پورے سلسلہ پر غور کرے جس زمانہ میں یہ احکام اترے ہیں تو اس کو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸۹-۲۰۳

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ ھِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۸۹ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ
كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾
وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ
بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ
فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا
تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٚ
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ
حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ ع ۲۴ ۸
الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

النصف

ترجمہ آیات ۱۸۹-۲۰۳

وہ تم سے محترم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۸۹

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ ۱۹۰-۱۹۳

شہر حرام، شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے، تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۹۴

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۹۵

اور حج و عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ پس اگر تم گھر جاؤ تو جو ہدی میسّر ہو وہ پیش کر دو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لیے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسّر آئے۔ جس کو میسّر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دورانِ حج میں رکھے اور سات

دن کے روزے واپسی کے بعد، یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لیے ہے جن کا گھر در جوارِ حرم میں نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۹۶

حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرے تو پھر اس کے لیے حج تک نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کے لیے تقویٰ کا زادِ راہ لو۔ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو۔ ۱۹۷

اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کے طالب بنو۔ پس جب عرفات سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعرِ حرام میں ٹھہر کر اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں تھے۔ ۱۹۸

پھر تم بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۱۹۹

پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر، حالانکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کیے کا حصہ ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۲۰۰-۲۰۲

اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ سو جو دو ہی دنوں میں اٹھ کھڑا ہو اس پر کوئی گناہ

نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھیں، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۰۳

۶۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۸۹)

اہلّۃ سے مراد — سوالات نقل کرنے میں قرآن کا طریقہ

اَہِلَّۃ ہلال کی جمع ہے۔ ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر جمع کی صورت میں تو اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے۔ اہلّہ پر الف، لام اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں سے متعلق ہے اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اشہر حرم اور ان کے احکام و آداب سے متعلق تھا چنانچہ آگے کی آیات میں اس سوال کے جو جواب دیئے ہیں وہ تمام تر حج اور اشہر حرم ہی سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید میں، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، سائلوں کے سوالات چونکہ اجمال و اختصار کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اس وجہ سے عام اہل تاویل کو یہ گمان ہوا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کے صحیح نہ ہونے کے مختلف وجوہ ہیں جن میں سے بعض کا ہم ذکر کریں گے۔

اول یہ کہ اس قسم کا سائنسی اور فلکیاتی سوال عربوں کے مذاق اور ان کی عام افتاد مزاج کے خلاف ہے۔ اہل عرب سورج اور چاند کو خدا کی مخلوق اور اس کے قانون طبیعی کے تحت ان کو مسخر اور محکوم مانتے تھے پھر اس نامعقول سوال کی کیا گنجائش تھی کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ وہ خود سمجھ سکتے تھے کہ یہ سوال پیغمبر کو زچ کرنے والا نہیں بن سکتا، وہ بڑی آسانی سے اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ یہ خدا کے حکم سے گھٹتا بڑھتا ہے اور یہ اس کے مسخر و محکوم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ یہ جواب اس سے پہلے مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں مکی سورتوں میں دیا بھی جا چکا تھا بلکہ وہ دلیلیں بھی ان کے سامنے موجود تھیں جو چاند کے طلوع و غروب سے حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے حق میں نکالی تھیں۔ پھر اس قسم کے سوال کا کیا موقع تھا؟

دوسری یہ کہ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ سوال عام عربوں یا اہل کتاب کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے چاند یا سورج کے گھٹنے بڑھنے کا سوال ایک بالکل ہی بعید از قیاس سوال ہے۔ وہ سوال کر سکتے تھے تو مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق کر سکتے تھے نہ کہ ایک بالکل ہی غیر ضروری اور لایعنی سوال۔

تیسری یہ کہ اگر سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق ہوتا تو یہ یوں نقل ہوتا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْهِلَالِ (وہ تم سے چاند کے بابت سوال کرتے ہیں) یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ کے الفاظ نہ ہوتے کیونکہ اس کے معروف معنی تو، جیساکہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہوں گے کہ وہ تم سے مخصوص مہینوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہ سوال نقل کر کے اس کے جو جوابات دیے ہیں وہ تمام تر جیساکہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، حج اور اشہر حرم کے احکام و آداب ہی سے متعلق ہیں، ان میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت کی طرف نہیں ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ قرآن نے ان کے اس سوال کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اس وجہ سے اس سے بالکل صرف نظر کر کے ان کو مہینوں سے متعلق کچھ مفید باتیں بتا دیں تو کم از کم یہاں کوئی اشارہ اس بات کی طرف ضرور ہونا تھا کہ لوگوں کو غیر ضروری سوالات نہیں کرنے چاہئیں جیساکہ دوسرے بعض مقامات پر اس قسم کی تنبیہ لوگوں کو کی گئی ہے۔

سوال اشہرِ حُرم سے متعلق تھا

بہر حال ہمارے نزدیک اس سوال کا کوئی تعلق بھی چاند اور اس کے اتار چڑھاؤ سے نہیں ہے بلکہ، جیساکہ ہم نے عرض کیا، ان محترم مہینوں سے اس کا تعلق ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے محترم چلے آ رہے تھے اور جن میں لڑنا بھڑنا جاہلیت کے زمانے میں بھی حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ خانہ کعبہ کے قبلہ قرار پا جانے اور کفار کے قبضہ سے اس کا چھڑانا ضروری ہو جانے کے بعد ان کے احترام کے ملحوظ رکھنے کے حدود و قیود کیا ہوں گے؟ اس سوال کو قرآن نے اجمال کے ساتھ نقل کر کے اس کا تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔ اوپر آیت ۱۰۸ کے تحت ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن میں بالعموم لوگوں کے سوالات نہایت اختصار کے ساتھ نقل ہوتے ہیں اور یہی بلاغت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ سوال کی اصلی نوعیت تو خود اس جواب ہی سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جو اس کے بعد دیا جاتا ہے، پھر سوال کے نقل کرنے میں طولِ بیان کی کیا ضرورت ہے؟ یہی اسلوب عربی زبان میں پسندیدہ اسلوب ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی ماہرینِ زبان کا معروف طریقہ یہی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن میں اس اختصار کی وجہ سے لوگوں کو تاویل میں اُلجھنیں پیش آئیں۔ بہت سے لوگوں نے سوال کی نوعیت جواب سے متعین کرنے کے بجائے خود سوال کے مجمل الفاظ سے کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے سوال اور جواب میں "سوال از آسمان جواب از ریسمان" کی شتر گربگی پیدا کر دی۔ لیکن یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ تاویل کرنے والوں کا اپنا قصور ہے۔

قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، یہ سوال کے جواب کا ایک حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ محترم مہینے لوگوں کی عوامی بہبود اور خاص کر حج و عمرہ کی سہولتوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ہم اوپر قبلہ کی بحث میں یہ وضاحت کر آئے ہیں کہ اشہر حرم نہ صرف عبادت کے نقطۂ نظر سے اہلِ عرب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے بلکہ ان کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں کا تمام تر انحصار بھی انھیں مہینوں پر تھا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت

میں سارا سال لڑنے بھڑنے میں گزارتے اس وجہ سے ملک میں تجارتی نقل و حرکت تقریباً معطل رہتی۔ یہ صرف اشہرِ حرم کا فیض تھا کہ سال میں پورے چار مہینے امن و امان سے گزرتے اور ان مہینوں میں اہلِ ملک حج و عمرہ کی برکتوں سے بھی سعادت اندوز ہوتے اور ملک و بیرونِ ملک کی تجارتی منڈیوں تک بھی بغیر کسی خطرہ کے پہنچتے اور ان سے لین دین کرتے، بالخصوص قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے تو یہ مہینے گویا بہار کے مہینے تھے۔ سارا عرب ان مہینوں میں مکہ کا رخ کرتا اور یہ وادی غیر ذی زرع سارے ملک کی تجارت کا مرکز بن جاتی۔ خانہ کعبہ اور اشہرِ حرم کی روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ قرآن نے ان کی ان مادی برکتوں کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور قریش کو اپنے اس احسانِ عظیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی ان محترم مہینوں کے اندر لوگوں کے لیے گوناگوں فوائد و مصالح مضمر ہیں اس وجہ سے ان کا احترام ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس عام فائدے کے ذکر کے بعد اس کے خاص فائدہ — حج — کا بھی ذکر فرمایا کہ یہی مہینے ہیں جن میں لوگ امن و امان کے ساتھ اس سنتِ ابراہیمی کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ پہلو بھی خاص طور پر ان کی حرمت کا متقاضی ہے۔

ایک تجدیدی اصلاح

"وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ" یہ حج کے ذکر کے ساتھ اسی طرح کی ایک تجدیدی اصلاح و تنبیہ ہے جس طرح کی اصلاحی و تجدیدی تنبیہ و تذکیر آیت ۱۷۷ میں دین کی بنیادی باتوں کے ذکر کے ساتھ گزر چکی ہے کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کی طرف رخ کرو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو ایمان لائیں ...... یہاں ارشاد ہوا کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ امتوں کی یہ عام بیماری رہی ہے کہ آہستہ آہستہ لوگ دین کے اصلی احکام و فرائض تو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور ان کی خانہ پری بدعات و رسوم سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اہلِ عرب کی حج کے سلسلہ کی بدعتیں

اہلِ عرب پر بھی یہی گزری۔ یہ لوگ حج تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کرتے رہے لیکن اس کی اصل روح سے اس کو بالکل خالی کر کے اور رسوم و اوہام کا ایک گورکھ دھندا بنا کر۔ ازاں جملہ انھوں نے حج کے سلسلہ میں یہ بدعت ایجاد کر لی تھی کہ حج کے لیے احرام باندھ چکنے کے بعد اگر انھیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی یا حج کے بعد جب گھروں کو واپس ہوتے تو ان دروازوں سے گھروں میں داخل نہ ہوتے جن دروازوں سے نکلتے بلکہ مکانوں کے پچھواڑوں سے کسی دوسرے راستے سے داخل ہوتے۔ اس عجیب و غریب حرکت کا محرک یہ وہم رہا ہو گا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد انھی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا خلافِ تقویٰ ہو گا۔ یہ وہم اسی طرح کا ایک وہم تھا جس طرح کے وہم میں وہ طواف کے معاملہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت سے عرب جاہلیت میں ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے، غالباً ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ لباس، جو زینت و آرائش کی چیزوں میں داخل ہے، اس کی کوئی دھجی بھی زہد و رہبانیت کی اس عبادت میں جسم سے لگی کیوں رہ جائے۔

قرآن نے اس بدعت کی تردید کی اور فرمایا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، اس سے تقویٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی مطلوب ہے تو اس کے حدود کی پاسداری ملحوظ رکھو اور اس سے برابر ڈرتے رہو۔ حج سے اصل مقصود یہی تقویٰ ہے۔

اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۱۹۰)

یہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر حج کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے۔ البتہ حدود سے تجاوز، اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یعنی نہ تو یہ بات جائز ہے کہ تم خود اشہر حرم میں جنگ کے لیے پہل کرو اور نہ یہ جائز ہے کہ مدافعت کے لیے جتنی کارروائی ضروری ہے، اس سے آگے کوئی قدم اٹھاؤ البتہ مدافعت کرنے کے تم پورے طور پر مجاز ہو، اشہر حرم یا خود حرم کا احترام اس میں کسی پہلو سے مانع نہیں ہے بلکہ یہ عین ان کے احترام کا تقاضا ہے۔ اس نکتہ کی تفصیل آگے کی آیات میں آرہی ہے۔

حج کے ذکر کے ساتھ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ اس وقت تک حرم پر مشرکین کا قبضہ تھا اس وجہ سے اس بات کا اندیشہ نہایت قوی تھا کہ اگر مسلمان حج کے لیے جائیں گے تو کفار روکیں گے اور جنگ کی نوبت آجائے گی، بالخصوص جب کہ مشرکین پر اس دوران میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ مسلمانوں نے بیت اللہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی وارث وہی ہیں، ایسی حالت میں یہ ضروری ہوا کہ مسلمانوں کو حرم اور اشہر حرم کے احکام و آداب سے متعلق وہ ضروری ہدایات دے دی جائیں جو آگے کے امکانی حالات میں ان کی رہنمائی کر سکیں، یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ حرم اور اشہر حرم کے احترام کے باب میں پوری قوم عرب کے احساسات نہایت نازک تھے۔ ان میں لڑنا بھڑنا سب ہی کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اس وجہ سے مسلمان بھی اس وقت تک ان میں کسی جنگ کے لیے، اگرچہ وہ مدافعت ہی میں کیوں نہ ہو، تیار نہیں ہو سکتے تھے جب تک قرآن اس کی اجازت نہ دے۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (۱۹۱)

یعنی بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حق دار تم ہی ہو اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق و فرض کی راہ میں قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے تصادم ہو وہیں ان کو قتل کرو۔ اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدود حرم ہی میں پیش آجائے اور جس مکہ سے انھوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی ان کو وہاں سے نکالو، اس لیے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیمؑ

کے ارشاد کے بموجب اس کے اصلی حق دار وہ ہیں جو ان کی ملت پر قائم ہیں۔ یہ درجہ تم کو حاصل ہے نہ کہ ان کو۔ اس وجہ سے اس گھر سے نکالے جانے کے مستحق وہ ہیں نہ کہ تم۔

'فتنہ' کا مفہوم

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے) فتنہ کے معنی یہاں کسی کو جبر و ظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کو (Persecution) کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۱۰۔ بروج (بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے والوں اور ایمان لانے والیوں کو دین سے پھیرنے کے لیے اذیتیں پہنچائیں ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے) عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۸۳۔ یونس (فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو مصیبت میں مبتلا کر دیں) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ۱۱۰۔ نحل (پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ طرح طرح کی ایذاؤں میں مبتلا کیے گئے)

اوپر کی اجازت کی دلیل

اوپر مشرکین قریش سے قتال کی جو اجازت دی گئی ہے یہاں تک کہ اگر حدودِ حرم اور اشہر حرم میں بھی وہ جنگ کریں تو ان کو قتل کرنا اور مکہ سے ان کو بے دخل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے، یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہرچند حدودِ حرم اور اشہر حرم میں قتل و قتال بڑی سنگین بات ہے لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لائے، یہ ظلم و ستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لیے تمھیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر نوبتِ جنگ پیش آجائے تو تم کفار کو ترکی بہ ترکی جواب دو اور جہاں کہیں وہ تمھارے مقابل میں آئیں ان کو قتل کرو۔ یہ چیز نہ احترامِ حرم کے منافی ہے نہ حرمتِ اشہر حرم کے۔

احتیاط کی تاکید

"وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ" یہ تاکید ہے اس بات کی کہ مسلمان مسجد حرام کے پاس جنگ میں پہل نہ کریں۔ ہاں اگر ان کو مسجد حرام سے روکنے کے لیے ان پر کفار کی طرف سے حملہ کیا جائے تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مسجد حرام کا احترام ایک مشترک ذمہ داری ہے اگر کفار مسلمانوں کی دشمنی میں اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی اس کے احترام کے نام پر کسی رعایت کے مستحق نہیں رہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے کیے کی سزا ہے۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ یعنی ایسے کافروں کا ایسا ہی بدلہ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۲)

'فَاِنِ انْتَهَوْا' کا مطلب

"پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ غفور رحیم ہے"۔ "باز آجائیں" سے مراد صرف جنگ سے رک جانا نہیں ہے۔ یہاں اس "باز آجانے" کا صلہ یہ بتایا ہے کہ "پھر اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے"۔ ظاہر ہے کہ کفار اگر مسلمانوں سے جنگ نہ کریں تو اس کا زیادہ سے زیادہ صلہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ان کو مہلت دیں اور بالفعل ان

سے جنگ نہ کریں، یہ صلہ تو اس کا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کفر و فسق معاف کردے۔ اس وجہ سے یہاں باز آجانے سے مقصود اس عناد و مخالفت، اور اس جبر و ظلم (PERSECUTION) سے باز آجانا ہے جس کے قریش مرتکب ہوئے تھے اور جس کے ذریعہ سے انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ اور ساتھ ہی بیت اللہ سے مسلمانوں کو روکنے سے باز آجانا ہے جس کے وہ کسی پہلو سے بھی حق دار باقی نہیں رہ گئے تھے۔

کفار قریش اور مسلمانوں کی نزاع

اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص کفار قریش سے ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملہ کے لیے محض ایک وقتی نزاع نہیں تھی بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لیے تھی۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی حقدار اہل ایمان ہیں نہ کہ کفار و مشرکین جنھوں نے اس گھر کو اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل خلاف شرک و کفر کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور وعدہ الٰہی کے بموجب جس آخری نبی کے ذریعہ سے اس گھر کے مقاصد کی تجدید و تکمیل ہونی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی نے اس وعدے کی تکمیل کر دی اور اب یہ لازمی ہے کہ یہ گھر کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو کر ملت ابراہیم — اسلام — کا مرکز اور تمام اہل ایمان کا قبلہ بنے۔ یہ دعویٰ جن دلائل و براہین اور جس زور و قوت کے ساتھ اس پوری سورت میں پیش ہوا ہے اس میں کہیں کسی لچک اور کسی نرمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک و کفر کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید و اسلام اور ملتِ مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدی کا اصلی نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آنحضرت صلعم کے مقدس مشن کا آخری کام تھا۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ فَاِنِ انْتَهَوْا کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کفار قریش جنگ سے رک جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے، جن کے وہ آج اس دعوتِ حق کی مزاحمت کے لیے مرتکب ہو رہے ہیں، باز آکر اس کے حامی و معاون بن جائیں۔ اگر وہ یہ راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے وہ تمام جرائم معاف کر دے گا جن کے وہ اب تک مرتکب ہوئے ہیں۔ بعینہ یہی بات کفار قریش ہی کو مخاطب کر کے سورۂ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ان کافروں کو بتا دو کہ اگر وہ باز آگئے تو جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر انھوں نے پھر اسی طرح کی حرکتوں کا اعادہ کیا تو ہمارے اس طریقہ

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۳۸-۳۹ - انفال)

کو یاد رکھیں جو ہم نے پچھلی قوموں کے معاملے میں اختیار کیا، اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ بالکل باقی نہ رہ جائے اور اس سرزمین پر سارا دین صرف اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز رہے تو جو کچھ وہ کریں گے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی حقیقت سورۂ توبہ میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کی تولیت میں کفارِ قریش کا کوئی حصہ نہیں ہے، یہ خاص مسلمانوں کا حق ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۷-۱۸ - توبہ)

مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈریں۔ انہی لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ بامراد ہوں۔

یہی خاص پہلو ہے جس کے سبب سے عام کفار کے برخلاف کفارِ قریش کے لیے یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ توبہ کر کے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کے لیے کوئی ڈھیل نہیں ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵ - توبہ)

پس جب اشہر حرم گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں ہم ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ان شاء اللہ کفارِ قریش کے اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۹۳)

سرزمین حرم میں اسلام کے سوا کسی اور دین کے لیے گنجائش نہیں

اس آیت سے اوپر والی آیت کے مضمون کی مزید وضاحت ہوگئی کہ کفار قریش سے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی ہے جب تک سرزمین حرم پر فتنہ کا کوئی اثر باقی ہے اور اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین یہاں قائم ہے۔ یہ گھر صرف اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا اس لیے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اور اب یہ کام حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہونا ہے، کفار اس کو پسند کریں یا ناپسند۔ اسی بات کو سورۂ صف میں یوں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی — وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا اپنی ہدایت

وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ — اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو سارے دینوں

كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹- صف) — پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اس چیز کو ناپسند کریں۔

رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی

"وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" کا صحیح موقع و محل اور اس کا اصلی زور سمجھنے کے لیے یہاں بالاجمال اس سنت اللہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے باب میں پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اس قوم کے لیے خدا کی آخری اور کامل حجت ہوتا ہے۔ جس کے بعد کسی مزید حجت و برہان کی اس قوم کے لیے ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی بلکہ تکذیبِ رسول اور عداوتِ حق ہی پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ فنا کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا ہو یا حق کے اعوان و انصار اور رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے یا اس کی وفات کے بعد۔ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ظہور کے لیے قرآن میں ایک مخصوص ضابطہ بیان ہوا ہے جس کی تفصیل کے لیے موزوں مقامات ہماری اس کتاب میں آئیں گے[1]۔

اسی سنت اللہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ اس آخری رسالت کے مقصد کی تکمیل اس بات پر ہونی ہے کہ سرزمین حرم پر دین حق کے سوا اور کوئی دین باقی نہیں رہنے پائے گا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے کفارِ عرب کے سامنے، جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہِ راست تھی اور جو بیت اللہ پر بالکل ناجائز طور پر قابض تھے، صرف دو ہی راہیں باقی رکھی تھیں۔ یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسرے کفار کی طرح ان کے لیے جزیہ کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ جب اتمامِ حجت کا تقاضا پورا ہوگیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور بیت اللہ پر قبضہ کر کے اس کو کفر و شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک کر دیا اور جَآءَ

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ میں نے یہاں جس سنت اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق خاص طور پر رسولوں سے ہے، ان انبیاء سے نہیں ہے جو صرف نبی تھے، رسول نہیں تھے۔ نبی اور رسول کے اس فرق پر بھی مفصل بحث اپنے مقام میں آئے گی۔

الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان فرما دیا۔

حرمِ الٰہی کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کا فرض

پھر حرمِ الٰہی کو مستقل طور پر کفر و شرک کے غلبہ سے پاک رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہُوا کہ اس پورے علاقہ کو غیر اسلامی قبضہ یا مداخلت سے بالکل محفوظ کر دیا جائے جس میں یہ حرم واقع ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرہ عرب کے متعلق یہ ہدایت دے دی کہ لَا یَجْتَمِعُ فِیْہِ دِیْنَانِ اس میں دینِ حق کے ساتھ کوئی اور دین جمع نہیں ہو سکتا۔ اور آخر وقت میں آپ نے یہود و نصاریٰ کو بھی اس سرزمین سے نکال دینے کی وصیت فرمائی جس کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی۔ یہ تدبیر مرکزِ اسلام کے سیاسی تحفظ کے لیے ضروری تھی اور یہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس گھر کے تحفظ کے لیے ہمیشہ بیدار رہیں اور کسی بھی غیر اسلامی طاقت کے قدم اس سرزمین پر جمنے نہ دیں۔

عربی زبان کا ایک اسلوب

فَاِنِ انْتَهَوْا، فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔ 'اِنْتَهَوْا' کا مفہوم ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ عدوان کے اصلی معنی تو تعدی اور زیادتی کے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ مجرد اقدام (action) کے معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا (ہم نے ان کو بدلہ دیا جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا) ظاہر ہے کہ یہاں دانوا محض دِنّا کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے ورنہ موقع فَعَلُوْا یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (برائی کا بدلہ اسی کے مانند بدلہ ہے) ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی سیئۃ سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر اس کے خلاف اقدام کرو) اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اس کو بھی اعتداء کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے۔ صرف اپنے ماسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہُوا۔ عربی زبان کے اسی معروف اسلوب کے مطابق زیرِ بحث آیت میں بھی لفظ عدوان استعمال ہُوا لیکن مراد اس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آ کر اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی، پھر صرف انھی کے خلاف کوئی اقدام ہوگا جو اپنے کفر و شرک اور اپنے ظلم و عدوان پر جمے رہ جائیں۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (۱۹۴)

تمام حرمتوں کا قصاص ہے

اوپر بیان کیے ہوئے احکام کی یہ دلیل ارشاد ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اشہرِ حرم میں یا حدودِ حرم میں لڑائی

بھڑ آئی ہے تو بہت بڑا گناہ لیکن جب کفار تمہارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمتِ جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہرِ حرم اور حدودِ حرم کا احترام مسلم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلدِ امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہرِ حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوقِ حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حقِ حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہرِ حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمھارے خلاف کریں، تم ان کے جواب ترکی بہ ترکی دو، البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمھاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حدِ ضروری سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۹۵)

انفاق کا حکم جہاد کے لیے

انفاق کا یہ حکم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس جہاد کے لیے ہے جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔ جہاد، جان اور مال دونوں کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس وجہ سے قرآن میں جہاں کہیں بھی جہاد و قتال کا بیان ہوا ہے انفاق کا حکم بھی اس کے ساتھ ضرور ہوا ہے۔ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (اور تم جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے)

”وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ میں بِاَیْدِیْكُمْ“ کے الفاظ سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے، کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ بعض عرب شاعروں نے بھی یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں، بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات سے بچا رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انسان کے لیے زندگی اور بقا کا اصلی خزانہ خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی میں ہے نہ کہ ان کے سینتنے اور بچانے میں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا — اور وہ عنقریب تمہیں اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے

لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ○ (۴۲-توبہ)

کہ اگر ہم سامان کر پاتے تو ضرور آپ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں جھونک رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

اس آیت میں يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ کے الفاظ سے اسی بخل اور بزدلی کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بچنے کی تاکید وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کے ٹکڑے میں فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو زندگی اور مال کے حریص کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

انفاق اور احسان کا مفہوم

وَأَحْسِنُوا کا عطف أَنفِقُوا پر ہے۔ یہاں احسان کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اور وہ مال خرچ کرو جو تمھیں عزیز و محبوب ہو۔ انفاق کے معاملے میں اس احسان کی تاکید قرآن نے جگہ جگہ فرمائی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ○ (۲۶۷-بقرہ)

اے ایمان والو! ان پاکیزہ مالوں سے خرچ کرو جو تم نے تجارت وغیرہ سے کمائے ہوں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے پیدا کیے ہیں اور اس میں سے بُرے مال کے خرچ کرنے کا خیال نہ کرو، جسے خرچ تو کرو لیکن اگر وہی مال تمھیں لینا پڑ جائے تو آنکھ بچے بغیر نہ لے سکو اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے۔

انفاق میں جب تک اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جوش و جذبہ اور یہ احتیاط شامل نہ ہو اس وقت تک اس کو احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہے۔ البتہ ہم خود اس کے جود و کرم کے ہر وقت محتاج ہیں۔ وہ اگر ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ خود ہمارے لیے کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ ہمارے خلوص کا امتحان کرے اور ہمارے خزف ریزوں کو قبول فرما کر ان کو ایک ابدی اور لازوال خزانے کی شکل میں ہمیں ایک دن واپس لوٹائے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱۹۶)

عمرہ کی نوعیت

جس طرح فرض نمازوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل ہیں جن سے اصل نماز کے لیے طبیعت میں بیداری

اور آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ان سے اس کسر کا جبر بھی ہوتا ہے اسی طرح عمرہ کی نوعیت بھی حج کے لیے ایک ریہرسل کی ہے۔ اس سے حج کے لیے طبیعت میں آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض حالات میں اس کے کسر کا جبر بھی ہوتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ لفظ تعمیر، رونق اور آبادی کے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے گھر کی رونق بھی ہے اور دلوں کی زندگی اور بیداری بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آیت ۱۹۶ کا اصلی مفہوم

"أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" میں اصل زور "لِلّٰهِ" کے لفظ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جنگ و جہاد کے مراحل سے گزر کر حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہو تو تم یہ حج و عمرہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے پورا کرو۔ اس تاکید و تنبیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حج و عمرہ تو اہل عرب اسلام سے پہلے بھی کیا کرتے تھے لیکن یہ حج و عمرہ صرف اللہ واحد کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں ان کے وہ معبودانِ باطل بھی شریک تھے جن کے بت انھوں نے عین بیت اللہ میں بھی اور مناسک حج کے دوسرے مقامات میں بھی نصب کر رکھے تھے۔ چنانچہ جب یہ حرم میں نماز کے لیے جاتے یا حج و عمرہ کے قصد سے وہاں پہنچتے تو ان کے پیشِ نظر صرف اللہ ہی کی عبادت نہ ہوتی بلکہ اللہ سے زیادہ ان بتوں کی خوشنودی اور ان کی پرستش ہوتی۔ وہ ان کی پوجا بھی کرتے، ان کے آگے نذر و نیاز بھی پیش کرتے اور ان کے لیے قربانیاں بھی کرتے۔ چونکہ آیت زیرِ بحث کے نزول کے وقت یہ حالات مکہ میں موجود تھے اس لیے مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی کہ جب تم حج و عمرہ کرو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرو، اس میں کسی شرک و بدعت کی کوئی آلائش شامل نہ ہونے پائے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ کوثر میں بھی ارشاد فرمایا ہے "إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا تو تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ کوثر سے یہاں مراد خانہ کعبہ ہے، جو آخرت کے حوضِ کوثر کا اس دنیا میں مجاز ہے اور اللہ ہی کے لیے نماز اور قربانی کی تاکید اس لیے ہوئی کہ اسلام سے پہلے نماز اور قربانی دونوں ہی بیشتر غیر اللہ کے لیے تھیں۔

علاوہ ازیں "لِلّٰهِ" پر زور دینے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اہل عرب کے لیے حج و عمرہ عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئے تھے۔ ان کے لیے ان کی حیثیت تجارتی میلوں کی رہ گئی تھی اور وہ مقاصد امتدادِ زمانہ سے ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ چنانچہ اس تجارتی مقصد ہی کے تحت انھوں نے نسئی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کے مہینے کو قمری کے بجائے شمسی حساب کے مطابق کر لیا تھا تاکہ یہ مہینہ تجارتی نقطۂ نظر سے ان کے لیے مناسب زمانہ میں پڑے۔ یہاں "لِلّٰهِ" کے لفظ سے مسلمانوں کو حج و عمرہ کے اصل مقصود کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ عبادتیں اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہیں نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں

کے لیے اس وجہ سے تم کفار و مشرکین کے برخلاف اللہ کو اپنا مقصود بناؤ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جو محدود اجازت دی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

امکانی خطرے کے لیے ہدایت

'فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ' احصار کے معنی گھیر لینے کے ہیں اور یہاں گھیر لیے جانے سے مراد دشمن کی طرف سے گھیر لیے جانے کے ہیں۔ آگے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کے الفاظ سے بھی اسی مضمون کا اشارہ نکلتا ہے اور وقت کے حالات بھی اسی بات کے حق میں ہیں، اس لیے کہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں مکہ پر مشرکین قریش کا قبضہ تھا اور انھوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نکال چھوڑا تھا بلکہ کسی قیمت پر بھی ان کو دوبارہ مکہ آنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے، اس امر کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمان اگر حج یا عمرہ کے لیے مکہ کا رخ کرتے تو وہ پوری قوت سے مزاحم ہوتے، چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو کفار نے سخت مزاحمت کی۔ یہ صورت حال متقاضی تھی کہ پہلے اس امکانی خطرے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت دے دی جائے۔ چنانچہ یہ ہدایت دے دی گئی کہ اگر دشمن تمھیں گھیرے اور بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو جو قربانی تمھیں میسر ہو وہ وہیں پیش کر دو، جہاں گھر جاؤ۔ حضورؐ نے اسی ہدایت کے بموجب حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

'محل' کا مفہوم

'وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ' مَحِلّ، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، حَلَّ یَحِلُّ سے ظرف ہے اور وقت اور جگہ دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سر اس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے اور نذر پوری نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ امن اور احصار کی دو مختلف حالتوں میں قربانی کے ٹھکانے لگنے کی شکلیں دو مختلف ہوں گی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے دونوں کے ثبوت موجود ہیں۔ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اس صورت پر عمل فرمایا جس پر مجبوری کی صورت میں عمل کرنے کی اجازت ہے اور بعد میں حج اور عمرہ دونوں کے موقع پر وہ طریقہ اختیار فرمایا جو عام حالات کے لیے ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں جس امن یا احصار کا ذکر ہے اصلاً اس کا تعلق دشمن سے ہے۔ دوسری مزاحمتیں جو مرض یا کسی اور مجبوری کے سبب پیش آ جائیں ان کا حکم اصلاً نہیں بلکہ تبعاً یہاں سے نکلتا ہے اور اس کا تعلق اجتہاد سے ہے۔

قربانی سے پہلے سر منڈانے کا کفارہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔ کسی بیماری یا تکلیف کے سبب سے اگر کوئی قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں اس کے اوپر کفارہ ہے۔ قرآن میں اس کفارے کی تین صورتیں بالاجمال بیان ہوئی ہیں۔ روزے یا صدقہ یا قربانی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تشریح فرما دی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھ دے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دے دے۔

آفاقی حجاج کے لیے ایک رخصت

فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ یہ آفاقی حاجیوں یعنی حدودِ حرم سے باہر کے عازمین حج کے لیے ایک رخصت بیان ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات حدودِ حرم کے اندر رہنے والوں کے لیے تو ٹھیک تھی اس لیے کہ ان کے لیے حج اور عمرہ کے لیے الگ الگ سفر کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن دور سے آنے والے حجاج کے لیے اس میں زحمت تھی اس وجہ سے شریعت نے ان کو یہ رخصت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے فارغ ہو جائیں پھر حج کی تاریخوں میں اس کے لیے نیا احرام باندھیں اور مناسک حج ادا کریں۔ البتہ اس صورت میں ان کے لیے قربانی ضروری ہے۔ اگر قربانی میسر نہ آئے تو دس دن کے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ تین دن کے روزے ایام حج میں اور سات دن کے حج سے لوٹنے کے بعد۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ، یہ احکام و ہدایات کی تفصیل کے بعد احکام کی اصل روح کی طرف توجہ دلا دی کہ اصل مقصود ان تمام احکام سے تقویٰ ہے۔ یہی ان کا حاصل ہے اور اسی سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان اس چیز کو نگاہ میں نہ رکھے تو نہ تو ان کا حق ہی ادا کر پاتا ہے اور نہ ان سے کچھ حاصل ہی کرتا بلکہ اس کی ساری زندگی خدا سے جھوٹی آرزوئیں باندھنے اور اپنے نفس کو ناروا الاؤنس دینے میں گزر جاتی ہے حالانکہ خدا کے طبعی قوانین جس طرح اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں اسی طرح اس کے شرعی و اخلاقی قوانین بھی اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں۔

اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (۱۹۷)

لفظ حج کا جامع استعمال

موقع دلیل ہے کہ حج کا لفظ یہاں حج اکبر اور حج اصغر یعنی حج اور عمرہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم الفاظ کی اس مخصوص نوعیت استعمال کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'معلومات' سے مقصود

'أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ' سے مقصود، 'ایام معدودات' کی طرح ان کے معین و محدود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ کچھ ایسی غیر محدود و غیر معین مدت نہیں ہے کہ حج یا عمرہ کی نیت کرنے والا ان کی پابندیوں کے تصور سے گھبرا اٹھے۔ بس چند معلوم و متعین مہینے ہیں تو جو شخص ان میں حج یا عمرہ کا عزم کرے وہ ان کی پابندیوں کو نباہے اور شہوت رانی، فسق و نافرمانی اور لڑائی جھگڑے سے بچے اور زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقویٰ کی کمائی کرنے کی کوشش کرے اگرچہ انسان کو اس جہاد میں اپنے جذبات و شہوات کی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے لیکن یہ چیز ہراساں ہونے کی نہیں۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جو چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں رہتی ہے اور وہ اس کا ایک دن بھرپور صلہ دے گا۔

حج میں رفث، فسوق اور جدال کی ممانعت کے وجوہ

یہاں رفث، فسوق اور جدال تین چیزوں کی نفی کی ہے۔ رفث سے مراد شہوانی باتیں ہیں، اس لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے، فسوق کے معنی خدا کی نافرمانی کے ہیں اور جدال سے مراد آپس کے لڑائی جھگڑے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔ حج میں ان چیزوں کی قطعی ممانعت کے بعض خاص وجوہ ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترک دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری ہے، اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر دو چند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

"وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى" میں ہمارے نزدیک اصل ترکیب کلام یوں ہے کہ تَزَوَّدُوا التَّقْوٰی فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى۔ یعنی سفر حج کے لیے نکلو تو تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، پہلی جگہ ایجاز اور بلاغت کے تقاضے کے تحت تقویٰ کے لفظ کو حذف کر دیا اس لیے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا، اگر پہلے مقام میں بھی اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس سے کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا اور قرآن مجید ہر عیب سے پاک ہے۔

اکثر لوگ یہاں تقویٰ کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک تَزَوَّدُوا کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لیے مادی زادِ راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں اس تاکید کی وجہ یہ پیش آئی کہ اکثر اہل عرب بغیر کسی زادِ راہ ہی کے حج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس طرح خود بھی زحمت اٹھاتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی موجب زحمت بنتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب حج کے لیے نکلا کریں تو اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام کر کے نکلا کریں۔

اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ حج کے لیے زادِ راہ کا انتظام مقدم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حج فرض ہی ان لوگوں پر کیا ہے جو پہلے سے اس کے لیے استطاعت رکھتے ہیں لیکن یہاں یہ معنی لینا عربیت کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں "فَاِنَّ" کا لفظ جب اس طرح آیا کرتا ہے جس طرح اس آیت میں آیا ہے تو وہ اپنے ماسبق کی توجیہ و تعلیل کے لیے آیا کرتا ہے۔ اگر "تَزَوَّدُوا" سے مراد مادی زادِ راہ ہوتا

تو اس کے بعد اس کی توجیہہ و تعلیل میں بھی اسی کی حکمت بیان ہوتی کہ کیوں اس سفر کے لیے زادِ راہ کا اہتمام ضروری ہے لیکن یہاں حکمت بیان ہوئی ہے تقویٰ کے زادِ راہ کی۔

اس ہدایت کے موقع و محل سے بھی اسی مضمون کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کے عزم سے نکلے تو وہ شہوانی باتوں، فاسقانہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے سے کلیۃً احتراز کرے۔ اس مضمون کے ساتھ اگر سب سے زیادہ قریبی جوڑ ہو سکتا ہے تو اسی بات کا ہو سکتا ہے کہ اس مقدس سفر کے لیے آدمی کو رفث، فسوق اور جدال کے بجائے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلنا چاہیے، اس لیے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی کا زادِ راہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا ھَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ (۱۹۸)

فضل سے مراد

یعنی حج سے اصل مقصود تو تقویٰ ہے، اس لیے اس کے واسطے اصلی زادِ راہ تقویٰ ہی کا ہونا چاہیے لیکن اس امر میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ کوئی شخص اس سفر سے کوئی چھوٹا بڑا تجارتی فائدہ بھی اٹھا لے۔ یہاں فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد تجارتی فائدہ ہے۔ اس قسم کے معاشی فوائد کے لیے قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بندہ جو معاشی فتوحات حاصل کرتا ہے وہ سب فضلِ رب میں داخل ہیں۔

اوپر والی آیت کے تحت ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں حج کا اجتماع ایک بہت بڑے تجارتی میلے کی نوعیت اختیار کر گیا تھا جس کے سبب سے حج کا اصل مقصد بالکل دب کر رہ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں واضح کیا کہ حج کا اصل مقصد عبادت ہے نہ کہ تجارت، اس وجہ سے اس سفر میں اسی کے شایانِ شان زادِ راہ لو، اور وہ ہے تقویٰ۔ لیکن اس کے اصلی مقصد کے اہتمام کے ساتھ اگر کوئی شخص کوئی نفع بخش کاروبار بھی کرے تو اس سے اس عبادت میں کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ یہ چیز جائز ہے۔

جاہلی رسوم کی مخالفت

"وَاذْكُرُوْهُ كَمَا ھَدٰىكُمْ" عرفات سے واپس ہوتے ہوئے مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں رات گزارنے اور وہاں اللہ کی یاد کرنے کا حکم ہے، اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ یہ اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے تمہیں بتایا اور سکھایا ہے، یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کی صورت میں اس طریقہ پر نہ ہو جو تم نے جاہلیت کے زمانے میں اختیار کر رکھا تھا جس طرح اس زمانے میں لوگ عید وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کرتے ہیں، پکنک کے پروگرام بناتے ہیں، مشاعروں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں، یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلیں بھی کہیں کہیں آراستہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح جاہلیت میں بھی لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے۔ قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی اس لیے کہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لیے ہے۔

"وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ" بطور امتنان و احسان کے ارشاد ہوا ہے۔ جس طرح سورۂ جمعہ میں ہے۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے) مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے احکام و آداب سے متعلق تمھیں جو رہنمائی کی جا رہی ہے اس کی قدر کرو، اس لیے کہ اب تک تم ان مقامات کو کھیل تماشے کی جگہیں بنائے بیٹھے تھے حالانکہ یہ مقامات انوارِ معرفت کی جلوہ گاہیں لیکن تم نے اپنی جہالت کے سبب سے جواہرات کے معادن کو کوئلے کی کان ہی سمجھا۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۹)

قریش کی مہنتی پر ایک ضرب

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں خطاب خاص قریش سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناسک حج کے معاملہ میں جو پابندیاں دوسروں پر ہیں بعینہٖ وہی پابندیاں تمھارے اوپر بھی ہیں اس وجہ سے جس طرح دوسرے تمام لوگ عرفات جاتے اور وہاں سے لوٹتے ہیں اسی طرح تم بھی عرفات جا کر وہاں سے لوٹا کرو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں حج کے موقعہ پر خاص اپنے لیے عرفات کی حاضری ضروری نہیں سمجھتے تھے، صرف مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے لوٹ آتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں اس وجہ سے ان کے لیے حدودِ حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ بندگی میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک امتیاز قائم کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے اس خود ساختہ امتیاز کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر کر دیا۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰)

ایک لغویت کی اصلاح

مناسک حج سے فراغت کے بعد لوگوں پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، تفریحات اور دلچسپیوں کا موڈ طاری ہوتا تھا اور شعر و شاعری اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، خاص کر قیام منیٰ کے ایام تو انھی چیزوں کے لیے خاص ہو کر رہ گئے تھے۔ شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبیلوں اور اپنے اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر نثر و نظم میں بیان کرتے اور طلاقت لسانی سے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے۔

قرآن نے اس لغویت کی بھی اصلاح کی اور اس کی جگہ اس سے زیادہ اہتمام اور اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

طالبینِ دنیا کو تنبیہ

"فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ الاية" یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے دل و دماغ کے ہر گوشے پر محبتِ دنیا کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ اسی چیز پر نگاہ رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سرفہرست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انھیں حج جیسی عظیم عبادت کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے تو اس میں بھی قبولیت دعا کے ہر موقع و محل میں خدا سے اپنی دنیوی آرزوؤں ہی کی تکمیل کے لیے دعا کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ ان کی آخرت کا خانہ بالکل ہی خالی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو حج کرتے ہی اپنے کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے ہیں، وہ جس مقام کو بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں دعا قبول ہوتی ہے وہاں وہ اپنی وہی درخواست پیش کرتے ہیں جو ان کے

دل پر غالب ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ اخروی فلاح کا کوئی ذکر بھی پسند نہیں کرتے کہ مبادا یہ چیز ان کی اصل آرزو کے لیے خدا کے سامنے کوئی حجاب بن جائے۔

اسی طرح کے لوگ ہیں جنھوں نے دین کی ہر چیز کو دنیوی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس سے دین کا حلیہ بگڑا ہے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جن کی دنیا پرستیوں نے حج جیسی عظیم عبادت کو بھی زمانۂ جاہلیت میں، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک تجارتی میلے کی شکل میں بدل دیا، اور یہی رجحان ہے جو اس دور میں حج کو صرف ایک سالانہ کانگریس کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ حج کی اصل ابراہیمی روح ہجرت الی اللہ ہے۔ اس کے دنیوی فوائد صرف ضمنی ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۱-۲۰۲)

صحیح روش کی طرف اشارہ

یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے ذہن دنیا اور آخرت دونوں کے معاملہ میں بالکل متوازن ہیں اور جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ پہلے گروہ کے بعد اس گروہ کا ذکر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس گروہ کی طلب اللہ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے اور اہلِ ایمان کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیے۔ اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑنا چاہیے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس وجہ سے بندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے۔ یہ بڑی سخت چیز ہے بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔

"اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا" (یہی لوگ ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے) پہلے گروہ کے متعلق، جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے، یہ فرمایا کہ "ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے" لیکن اس دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور یہ حصہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے بدلہ کے لیے مقرر فرما رکھا ہے۔

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ کا مفہوم

"وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ" (اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) تہدید اور تسلی دونوں موقعوں کے لیے موزوں ہے اور قرآن مجید میں یہ دونوں ہی موقعوں پر استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ آخرت کے عذاب و ثواب کو ایک بہت بعید چیز سمجھ کر اپنی بدعملیوں میں بدمست رہتے ہیں کہ جو چیز اتنی دور ہے اس کی فکر میں ابھی سے مبتلا ہو کر اپنے عیش کو کیوں مکدر کریں، ان کو ان الفاظ سے یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ آج تم جس حساب و کتاب

کو بہت دور کی چیز سمجھ رہے ہو جب وہ سر پر آئے گا تو تم یہ سمجھو گے کہ اس پر تو ایک صبح و شام بھی نہیں گزری۔

اسی طرح جو لوگ اللہ کے اچھے وعدوں کو وعدہ فردا سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ظہور میں ایک غیر متناہی مدت باقی ہے، ان کو ان الفاظ سے یہ تسلی دی جاتی ہے کہ اطمینان رکھو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہوگی، جب تمھیں اجر ملے گا تو محسوس کرو گے کہ تمھاری مزدوری تمھارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تم کو مل گئی۔

موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ دھمکی کے سیاق میں نہیں بلکہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان معاملات میں ساری اہمیت اس احساس کی ہے جو انسان کو جزا و سزا کے وقت ہوگا۔ اگر جزا و سزا کے وقت کا احساس یہی ہوگا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ اب بالکل غائب ہوگیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو۔ نہ وہ مہلت سے مغرور ہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر۔ اور اگر کوئی شخص اپنی ناسمجھی سے اس فاصلہ کو اہمیت دے بھی تو اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ من مات فقد قامت قیامتہ کہ جو شخص مرا اس کی قیامت کھڑی ہوگئی۔ جو مومن ہے آنکھ بند ہوتے ہی، اس پر اس کے نیک اعمال کی کیفیات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے اور کافر پر اس کے بداعمال کی۔ پھر عمل اور جزا میں فاصلہ کیا رہا؟ ادھر انسان نے زندگی کا بوجھ اتارا ادھر جزا اور سزا کھڑی ہے!

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳)

حج کا اجتماع روز حشر کے اجتماع کی یاددہانی ہے

"ایام معدودات" کے الفاظ جس مقصد سے روزے کے ذکر میں وارد ہوئے ہیں اسی مقصد سے یہاں بھی وارد ہوئے ہیں۔ اور مراد ان سے ایام تشریق یعنی قیام منیٰ کے ایام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ گنتی کے چند دن ہی تو ہیں تو ان میں ذکر الٰہی کے خزانے میں جتنا اضافہ کر سکتے ہو کر لو۔ اس قلیل مدت کو بھاری اور گراں سمجھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے اس امر کی اجازت ہے کہ جسے کوئی عجلت ہو تو ۱۲ ذی الحجہ ہی کو واپس ہو جائے ورنہ ۱۳ تک کے قیام کا ثواب حاصل کرے۔ دونوں ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس عجلت کا باعث ان ایام کی گرانی اور طوالت کا احساس نہ ہو بلکہ کوئی واقعی ضرورت اس کی داعی ہو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ بہت سے لوگ عرفات سے واپس ہوتے ہی جلد سے جلد بقیہ مناسک سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ایک حد تک تو فطری ہے لیکن اس میں بیزاری اور گھبراہٹ کی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس چیز کا کوئی اثر ہو تو یہ تقویٰ سے بعید بات ہے اور انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اس دن اس کے حکم کے بغیر کوئی اس کے سامنے سے ہٹ نہ سکے گا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حج کا یہ اجتماع روز حشر کے اجتماع کی ایک یاد دہانی ہے اس وجہ سے اس مجاز میں اس حقیقت سے غفلت نہیں ہونی چاہیے۔